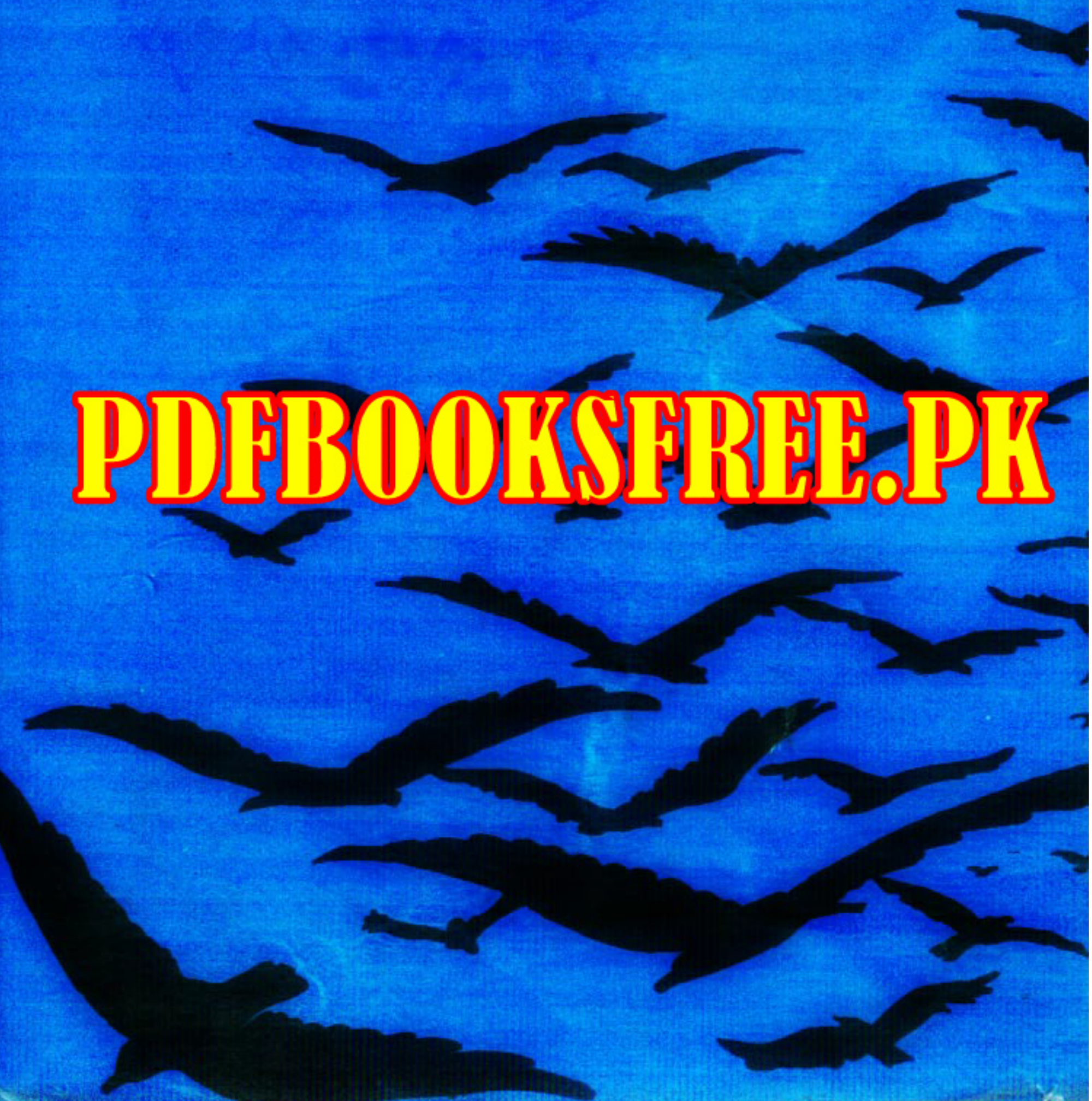


پرنڈے

مستقر حسین طاہر

PDFBOOKSFREE.PK



Courtesy of Pakistan Virtual Library

www.pdfbooksfree.pk

پاکستان کے سب سے بڑی آن لائن لائبریری

۱

ایک گدھ نے دوسرے سے کہا: ”نیچے دیکھ“

دوسرے گدھ نے پر پھیلانے ”نیچے تو کچھ بھی نہیں۔ ایک بندہ ہے، اجاڑ
بیابان ہے اور ایک ٹنڈ منڈ درخت۔ بس!۔ کھانے والی تو کوئی چیز نہیں“
”بندہ ہی تو کھانے والی چیز ہے، احمق۔“ پہلے گدھ کے پروں کا سناٹا لپھے
کے ایک بے کی مانند آسمانوں کے چپ چاپ شیشے پر گرا اور اُسے چکنا چور کر گیا۔
”کیونکہ یہ دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو تمام جانداروں
سے بلند و برتر سمجھتا ہے۔ اشرف المخلوقات۔ لیکن اس کے بھائی بندہ۔۔۔
جیسے بی مار ڈالتے ہیں۔ اور مرا ہوا بندہ کس کام کا؟۔ پھول کر کپتا ہو جاتا ہے۔
بو دینے لگتا ہے۔ زندگی کی رقی ختم ہونے سے اُس کا گوشت بھی پھیکا اور بد مزہ
ہو جاتا ہے، ایک نوالہ لیتے ہی پیٹ اچھر جاتا ہے۔ لیکن ایسا جیتا جاگتا بندہ
جو اپنے ہی بھائی بندوں کے پاتھوں زندہ درگور ہو جاتا ہے، اوہ، وہ بہت لذیذ
ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ چونچ ماسے سے اُس کی لاتعداد خواہشوں کا تازہ خون تمہارا

”پکھیر“ کے اردو ترجمے کے لیے میں محترم محمد سلیم الرحمن کے مشوروں
اور راشد جاوید احمد کی کاوشوں کا شکریہ گزار ہوں۔

سرورق : پروفیسر سعید اختر

www.pdfbooksfree.pk

حلق ترکر دیتا ہے۔ بے شک اس کی آنکھوں کے ڈھیلے نکال کے کھا لو۔
وہ خاموش کھڑا ہے گا اور پچ پچ کا مرا ہوا بندہ؟ نہ نہ کسی کام کا نہیں۔
بتیاں گتے کھانا اس سے بہتر۔

دوسرے گدھ کے سُرخ تالو میں خون کا سلونا سواد پھوٹا تو اس نے اپنی چونچ
سختی سے بند کر لی مبادا یہ سواد کھونہ جائے۔

”تو نے بندہ کبھی نہیں کھایا؟“ پہلے گدھ نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی سادہ لوح
اپنے بیٹے سے پوچھے کہ ابے تو نے شکر والا شربت کبھی نہیں پیا؟

”کوئی ایک بار۔“ دوسرے گدھ نے چونچ کھولی۔ ”گذشتہ برس سیلاب میں
مردہ مویشیوں کے درمیان ایک آدھ بندے کی لاش بھی تو تیرتی آجاتی تھی۔ اور
پھر وہ گھبرو یاد ہے جو چار جماعتیں پڑھ کے یہ سمجھنے لگا تھا کہ اُسے چودھری سے
نکمر لینے کا حق مل گیا ہے۔ اُس نے چودھری کے احاطے میں بندھے ڈنگروں
کے باسے میں جا کے پولیس سے شکایت کی کہ ڈنگر تو چرا کر لائے گئے ہیں۔ اگلے
روز اُس کے جسم کے حقے بیلے میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے کھایا۔

اُس کی ٹانگیں، بازو اور پیٹ تو وہاں تھے لیکن اس کا سر کہیں نظر نہ آیا۔
کچھ مزا نہیں آیا تھا کیونکہ تجھے پتا ہی ہے کہ میں دماغ اور آنکھیں کتنے شوق سے کھاتا
ہوں۔ پھر وہ شادی شدہ عورت بھی جسے رات بس نہ ملی تو وہ انتظار گاہ میں جا
سوئی۔ رات کو معززین شہر نے اس کے بدن کو نوچا دیا ہماری جگہ اور صبح اُسے پلوعے

لائن پر پھینک آئے۔ میں نے گندے نالے میں بہتا ہوا وہ بچہ بھی کھایا تھا
جس کا جسم ابھی ماں کے خون میں لتھڑا ہوا تھا، جس کی حیاتی کی گاڑی چلنے سے پشیر
ہی کھڑی ہو گئی تھی۔ اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا، جنگیں بھی تو ہوتی ہیں۔
اتنے بندے مرتے ہیں کہ اگر میرے پاس کوئلہ سٹوریج ہو تو اُن سب کو سنبھال کے

رکھ لوں اور ساری عمر بیٹھا ٹھونگتا ہوں۔ کڑیل جوانوں کے یہ مُردے برے
لذیذ ہوتے ہیں۔ (کچھ شہید اور کچھ کافر۔ کون کیا ہے۔ یہ فیصلہ نہیں ہو
سکتا۔ سرحد کے ایک طرف مرنے والا شہید اور دوسری طرف مرنے والا۔
کافر!)

”تو مرے ہوئے بندوں کی باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کسی جیتے جاگتے جسم
میں بھی چونچ ماری ہے؟“

”نہیں۔“ دوسرے گدھ نے ایک بھوکی آہ بھری، ”کبھی نہیں ماری۔“
”تو پھر اپنی چونچ اور تیز کر لے۔ مرے ہوئے بندے کھانے کے دن لے
گئے۔ اب زمین پر ایسے قانون بن گئے ہیں کہ سناے سوچنے سمجھنے والے بندے
جیتے جاگتے مر چکے ہیں۔ ہم کھا کھا کے اچھر جا میں گے مگر وہ کم نہ ہوں گے۔“
”تو پھر انتظار کیسا؟ آ اس بندے کو کھالیں“

”نہیں ابھی نہیں۔“ پہلے گدھ نے سمجھایا، ”ابھی وقت نہیں ہوا۔“
دوسرے گدھ نے ایک اور بھوکی آہ بھری، گردن لمبی کی اور چنڈھی آنکھوں
سے نیچے دیکھنے لگا۔

ایک اجار، تق و وق میدان، جس کا کوئی انت نہیں، بے حساب جہاں تک نظر
جائے، سفید کلرز و زمین۔ کھر کی سفیدی آنکھوں کو چند حیاتی ہوئی۔
درمیان میں ایک بندہ۔ تن تنہا، جیسے سانس روکے کھڑا ہو۔ جیسے پتھر پلا
بنت ہو۔ اس کے آس پاس بھی کوئی شے نہ تھی، سوائے ایک ٹنڈ منڈ درخت
کے۔ نہ اُس پر پتے، نہ شاخیں۔ بندہ اور ٹنڈ منڈ درخت، دونوں چیزیں
گدے کو اس طرح دکھائی دیں گویا کسی نے پتھر سے مورتیں گھر کے اُس چٹیل
میدان کے بیچ رکھ دی ہوں۔



دو سائے اُس کے اوپر سے چپ چاپ گزر گئے۔
 بندے نے ایک لمبا سانس لیا اور سر اٹھا کر نظر آسمان میں گاڑ دی (دوسرے
 گدھ نے اسے سر اٹھاتے دیکھا اور سوچا: "نہیں پتھر کی مورت نہیں، سچ پچ کا بندہ
 ہے۔" اس کے اوپر دو گدھ اس طرح پر پھیلائے تیر رہے تھے جیسے اُن میں
 جان نہیں۔ اُس پتنگ کی طرح جس کی حیاتی کی ڈور کٹ جائے تو وہ چند لمحوں کیلئے
 اُسی طرح اڑتی رہتی ہے۔ یہ گدھ کہیں میرے مرنے کی آس میں تو نہیں؟ کہیں یہ
 آسمان سے اُنڈر کر میری بوٹیاں نہ نوچ لیں؟ تنہائی کے اس میدان میں میری تومد کو بھی
 کوئی نہیں آئے گا۔ جسم میں چونچوں کے کھینے کی اذیت مجھ سے بھی نہیں جائے گی۔ مگر
 سہی کیوں نہیں جائے گی، وہ ذرا سا ہنسنا۔ میرے جسم کو تو گدھوں کی چونچیں بہنے کی
 عادت ہے، یہ الگ بات کہ یہ چونچیں میرے اپنے ہی بھائی بندوں کی تھیں جو مجھے
 ساری زندگی نوچتے رہے۔ اب میں دکھ اور سکھ کی منزلوں سے کہیں دور نکل چکا ہوں
 — گدھوں کو آنے دو، اُن کی تیز چونچیں بے شک میرے جسم میں اس طرح کھب جائیں

"اگر میں نے اس پتھر کی مورت کے چونچ ماری تو کہیں میری چونچ ہی نہ ٹوٹ
 جائے؟" دوسرے گدھ نے سوچا — اس کے ساتھی نے سچ کہا تھا۔ نہیں
 ابھی نہیں — ابھی وقت نہیں ہوا۔



جیسے تازہ مکھن میں کسان عورت کی انگلی کھینتی ہے اور پھر بھی مجھے ذرا برابر پتا نہیں چلے گا۔

بندے نے نظریں آسمان سے اُتاریں اور اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرف دیکھا جو اس بے انت چٹیل میدان میں اُس کا اکیلا جاندار سا تھی تھا۔ یہ ٹنڈ ہمیشہ سے یہاں نہیں تھا۔ پہلے تو یہ جگہ بھی اُس پاس کی طرح چٹیل اور بخر تھی۔ پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا آہستہ آہستہ زمین کے ایک بخر ٹکڑے پر دُوب اُگنے لگی۔ ایسی دُوب جو نہ تو کبھی ہری ہوتی تھی اور نہ ہی مکمل طور پر سوکھتی تھی۔ یہ دُوب اپنی حیاتی کیلئے زمین کے اندر سے اُن گنت زمانوں میں مرنے والوں کی ہڈیوں میں سے خون چوستی تھی۔ لیکن ان سب کا خون پینے کے باوجود اس پر سرخ پھول نہ کھلے، ایسے پھول جو پُل دو پُل کے لئے بچھرنے والوں کو واپس لا کر اُن کے گم گشتہ خدو خال کی جھلک اپنے میں دکھا گئے ہوں۔ دُوب ویسی کی ویسی ہی رہی، نہ بالکل ہری نہ بالکل خشک۔ وقت گزرتا گیا۔ اُن گنت صبحوں میں سے ایک صبح ایسی آئی جب بندے نے دیکھا کہ اس کے سامنے اس کا ہمزاد کھڑا ہے۔ اُس کا اپنا سایہ۔ وہ سر سے پاؤں تک مسرت سے کانپنے لگا کہ چلو اس دیرانے میں اُس کا اکلا پا توڑنے کے لئے کوئی روح تو وارد ہوئی۔ پر نہ تو یہ اس کا ہمزاد تھا اور نہ سایہ۔ یہ ایک سوکھا سٹرابے برگ ٹنڈ تھا۔ دُور سے یوں دکھائی دیتا جیسے کوئی بازو پھیلائے کھڑا ہو، یسوع مسیح صلیب میں پرویا ہو۔ بندے نے سوچا، میں بھی کتنا کم عقل ہوں، میری طرح کتنے لوگ دین دنیا چھوڑ کر ویرانوں میں اکھڑے ہوتے ہیں۔ اس بیابان میں اور کون آئے گا پھر بھی شکر ہے میرا اکلا پا ختم ہوا، انسان نہ ہی زمین کے راستے سانس لینے والا ایک ٹنڈ منڈ درخت ہی ہے۔ اس طرح وہ ٹنڈ۔ سوکھی لکڑی کی موت، اس کا بیل بن گیا۔ بندہ اور ٹنڈ۔ کلر زدہ زمین کے بے کراں سفید سمندر میں چھوٹے

www.pdfbooksfree.pk

چھوٹے دو جزیرے —

اُس لمبے چوڑے بے انت میدان میں ہمیشہ تین بدلتی رہتی تھیں۔ سدا ایک رُت نہ رہتی تھی۔

کبھی اچانک سورج کی کوکھ میں سے پکتے شعلوں کے ڈباؤ سیلاب بہہ نکلتے اور بندے اور ٹنڈ کے اُس پاس پھیلے میدان کو بھرنے لگتے اور کبھی کلر زدہ زمین میں سے شعلوں کی شوکتی ہوئی زبانیں آسمان کی جانب لپکتیں اور پھر اوپر سے نیچے آتے ہوئے شعلے اور نیچے سے اوپر لپکتی ہوئی سُرخ زبانیں اس طرح گھل مل جاتے کہ زمین اور سورج کے درمیان ہر شے سلگنے لگتی۔ ٹنڈ کے دونوں بازو اور تنا بھی دھیرے دھیرے سلگنے لگتے اور بندہ؟ وہ تو پہلے سے ہی سلگ رہا تھا۔ شعلوں کے اس جھکڑ کی وجہ سے ہر سوا اس طرح شور مچ جاتا جیسے عرش منورہ کے تمام دروازوں پر دُکھی مخلوق دستک دے رہی ہے۔ کچھ دیر بعد شعلوں کے یہ سیلاب اپنی ہی تپش میں خشک ہونے لگتے اور پچھلے پاؤں واپس سورج کے اندر جادفن ہوتے۔ سُرخ زبانیں سکڑنے لگتیں اور زمین انہیں اپنے اندر کھینچ کر بھینچ کر سرد کر دیتی۔ پھر ریشتی ہوئی شیشہ دھوپ یوں مدھم ہوتی چلی جاتی جیسے کسی نے اس کا کنٹرول سوچ گھما کر اس کی گرمی کو نائل کر دیا ہو۔ موت کا سایہ بھی تو زندگی کی گرمی کو آہستہ آہستہ چوس لیتا ہے اور یوں ہر شے میں سے حرارت نچڑ جاتی۔ تپتی ہوئی زمین ٹھنڈی برف ہو جاتی۔ ٹنڈ میں سے نکلتا دھواں فضا میں تحلیل ہو جاتا اور سردی اس کی خشک رگوں میں ایسے اُترتی کہ وہ ٹوٹنے لگتیں۔ ٹھنڈی برف ہوائیں اُڑتے ہوئے سانپوں کی طرح پھنکارنے لگتیں۔ سارا میدان ایک مرے ہوئے بندے کے رخسار ہو جاتا، زرد اور سرد۔ بندے کے جسم میں بھی برفوں کے ٹھنڈے بھالے اُترنے لگتے۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین بھی ارد گرد کی ہر شے کی طرح یخ بستہ ہو جاتی۔

سردی اُس کے ٹوٹے ہوئے بوٹوں میں سے جذب ہوتی ہوئی اوپر چڑھتی اور ٹانگوں، گھٹنوں، پیٹ کو کپکپاتی دل کے آس پاس جا پہنچتی۔ پر اس کا دل تو ہمیشہ سے ایک آگ تھا۔ باہر سردی ہو یا گرمی اندر ہمیشہ سائیں کا پمچ جلتا رہتا اس الاؤ کی آپنچ سردی کا راستہ روک لیتی۔ نیچے زمین سے آتا ہوا سردی کا زور اور اُدھر دل میں جلتے الاؤ کی حدت۔ دونوں رقیبوں کی طرح بھڑکتے بہتے۔ یوں نہ سردی ختم ہوتی اور نہ حدت۔

کبھی کبھار بالکل جس ہو جاتا۔ ہوا اُس میدان میں آنے والے تمام راستے بھول جاتی۔ کسی ایک جھونکے کی پھونک بھی سنائی نہ دیتی۔ میدان ہوا کی اڑان کو ترستا مگر وہ سلسلے رستے بھولے رہتی۔ بندے کا سانس گھٹنے لگتا۔ اُس کا رُواں رُواں پیاسے پرندوں کی طرح منہ کھول دیتا (اگر مجھے اسی طرح جس میں تازہ ہوا کے بغیر زندگی گزارنا تھی تو اس میدان میں آنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں رہتا اُسی جہان میں)۔ اور جب اُس کے پھیپھڑے اُسے یہ سندیسہ بھیجتے کہ انہوں نے سائے میدان میں سے ہوا کی آخری سُختی لپیٹ کر اپنے اندر ڈال دی ہے تو پھر پھر نہ جانے کونسی سمت سے ہوا کا ایک جھونکا کسی گم شدہ بچے کی طرح اُدھر آ نکلتا اور اُس کے کھلے، ترستے ہوئے منہ میں اتر جاتا، اپنے گھرواپس آ جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی جھکڑ چلنے لگتے۔ آندھیوں کی شوکا، لاکھوں آہوں کی طرح ہر سو گونجنے لگتی، کلر زمین کی گود سے الگ ہو کر آسمان، جانب یوں اڑنے لگتا کہ سارا میدان کورے کاغذ کی طرح سفید ہو جاتا۔ بندہ اور ٹنڈ ان گھنے سفید ذروں میں سفید ہو جاتے۔ ان گنت بگولوں کی چکیاں چلنے لگتیں اور بندہ ان کے پاٹوں کے درمیان پستا چلا جاتا۔ اور پھر یکدم آندھی کا زور ٹوٹنے لگتا۔ جھکڑ سانس روک لیتے۔ اور اس طرح۔ سورج میں سے شعلے بہتے رہے۔ سردی کا سمندر شوکتا رہا اور

جھکڑ اپنی ہی شدت میں شدید ہوتے رہے۔ اور بندہ؟ بدلتی رُتوں کے اس میلے میں جنگل میں گم ایک مسافر کی طرح حیران کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ کس کا؟ کیا انتظار؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ بس وہ وہاں کھڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ لیکن یہ اُجاڑ میدان، یہ بے انت میدان کہاں تھا؟

اس جہان کے کونسے کونے میں روپوش تھا؟

یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

یہ سوال، سوال ہی رہا، کسی نے جواب نہ دیا۔

شاید ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں؟

یا شاید بندے کے خیالوں میں!

پتہ نہیں کہاں تھا۔

.....

ایک قہقہہ؟

سادن کا سیاہ بادل برسنے سے پہلے کڑکتا ہے، اس طرح کا۔

یہ کڑک اس کے آس پاس ویرانے میں گونجی۔

جیسے کل خدائی ہنسنے لگے۔

روزِ محشر خلقت کا شور۔

قہقہے کا شور چاروں طرف پھیل گیا۔ لیکن بندہ؟

وہ تو چپ تھا، ہونٹ بھنجے ہوئے سُختی سے۔

کون ہنسا ہے؟

اُس نے آس پاس کی ہر شے کو غور سے دیکھا۔

اُجاڑ میدان اور درمیان میں ٹنڈ کی صلیب،

وہ چپ تھے

اُس نے اپنے اندر بھاگنا

یہ ہنسی تو اُس کی اپنی ہی تھی۔

چپ کے سانپ کے قریب سے آہستہ سے، چپکے سے

باہر آجانے والی ہنسی۔

ہنسی، اُس کے اپنے لبوں کی معزور

جو نہی چپ کا سانپ اُس کے ہونٹوں پر کُنڈلی مار کر بیٹھا، اُس کے اندر امن

ہو گیا۔ اس کے بعد جب بھی اُس نے اس سانپ کو چپ کی اس جونک کو ہونٹوں

سے کھینچ کر اُتار اور اُس نے لب کھولے، وہ گویا ہوا تو اُس کی دہائی کل جہان میں

آوارہ روحوں کی طرح پھیل گئی۔ مگر پھر بھی ہر طرف چپ تھی۔ اُس کو اپنی دہائی

کا کوئی جواب نہ ملا۔۔۔۔ وہ بولتا رہا اور بول بول کر اُس کا گلا بیٹھ گیا، کسی نے

توجہ نہ کی، جواب نہ دیا۔ کیونکہ ان سب کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب

نہ تھا۔ اور وہ تھک ہار کر پھر خاموش ہو جاتا اور چپ کے سانپ کو ہونٹوں پر

بٹھا کر اُسے اپنے سانس کا دودھ پلانے لگتا اور یوں امن ہو جاتا۔ وہ جب

تک اس جہان میں رہا خزانے کے چوکیدار کی طرح چپ کے سانپ کو ہونٹوں پر

بٹھائے رکھا۔ کیونکہ وہ بول سکتا تھا، وہ سوچ سکتا تھا اور لفظوں کے خزانے کا

اُس جہان میں کوئی بیوپاری نہ تھا۔

مگر آج یہ قہقہہ، یہ ہنسی کہاں سے آگئی؟

چپ کی کوٹھڑی میں کس نے سید لگا دی؟

اُس نے دُستے دُستے ہونٹوں پر زبان پھیری،

ہمیشہ کی طرح چپ کے سانپ کی زبان نے

اس کی زبان کو نہ ڈسا

زہر کا ذائقہ بھی نہ آیا۔

سانپ کے نرم جسم نے راستہ نہ روکا۔

شاید وہ سانپ کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

اُسی جہان کے اندر

جہاں ان سانپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب اُس کے ہونٹوں پر کوئی پہرا نہ تھا،

بولنے کے لئے آزاد

اُس کے لبوں کے معزور نے اُسے آزاد کر دیا تھا۔

تب وہ جی بھر کے ہنسا اور ہنستا رہا۔

اُس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دونوں گدھا اُس کے وحشی قہقہے کی کڑک سے

سہم کر آسمان میں روپوش ہو چکے تھے۔

وہ اس اُجاڑ میدان میں کیسے پہنچ گیا؟ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں؟

تجھے کس کا انتظار ہے؟

وہ کون سے ہاتھ ہیں جنہوں نے تجھے دھکیل کر یہاں پہنچا دیا ہے؟

اُس نے اپنے اندر سے پوچھا اور دماغ کی زمین میں گئے وقتوں کے ہل کا

زنگ آلود پچالا کھبا اور چلنے لگا، گہرا اور مسلسل۔



اور میں ان راستوں کو ڈھونڈ نہ سکوں۔
 میری آواز چاروں اُور اُڑان کرتی ہے
 مگر مجھے کچھ بھی نہیں ملتا۔
 اس بے انت خلا میں،
 اس بے حساب خلا میں،
 اس ریتلے میدان میں،
 ریت، جو آنکھوں میں چبھتی ہے۔
 موت کی طرح سیاہ ریت۔
 ریت، زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی
 اور پھر — ایک آواز!
 میں اُس آواز پر کان لگا دیتا ہوں،
 خون خشک کر دینے والی — مگر دلکش۔
 آواز کہتی ہے،
 تمہارا قیاس ہے —
 کہ تم ایک گم شدہ روح ہو؟
 تمہارا خیال ہے کہ تم ایک روح ہو؟
 تم بھولتے ہو۔
 تم روح نہیں ہو
 تم گمشدہ بھی نہیں ہو،
 تم —
 کچھ بھی نہیں

۳

میں ایک بیک نمبر ہوں۔
 اگر بندہ تیس برس سے اُپر کا ہو جائے
 تو بیک نمبر ہو جاتا ہے۔
 مائی بوڑھیوں سے بھرا میدان۔
 ایک گدھا گدھا!
 گدھوں کا اجتماع!
 زندگی کے جوہر کی جونکیں۔
 ایک سفید دیوار۔

 اگلانیتن کی طرح،
 ایک اُجاڑ ریتلے میدان میں،
 میں ڈھونڈنے آیا ہوں، گم شدہ راستے۔

تمہارا کوئی وجود نہیں —

لیکن بندہ اچانک ہی تو اُجاڑ میدانوں میں گمشدہ راستے تلاش کرنے کے لئے نہیں آجاتا۔ اُس کی روح ازل سے تو ہر سو اُٹان نہیں کرتی۔ وہ پیدا ہوتے ہی تو اس بے حساب خلا میں ٹنگنے نہیں لگتا۔ ہمیشہ سے بیک نمبر نہیں ہوتا۔ وہ تو یہاں تک حیاتی کے آدھے کھیت میں ہل چلا کر پہنچتا ہے — یا پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہاں اور وہاں کے درمیان لمحوں، دنوں اور برسوں کے نالے، نہریں اور دریا ہوتے ہیں جنہیں عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچتا ہے۔ پیچھے مڑ کے دیکھے تو حیاتی کے کھیت میں کہیں کہیں ہریاؤں کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور باقی زمین بنجر اور بے آباد ہوتی ہے۔ وہ انہی اکا دکا ہریاؤں کے ٹکڑوں کی باس اپنے اندر اُنڈلیتا ہے اور آنے والے دکھوں کو سہنے کا چارہ کرتا ہے۔ میدان میں کھڑے بندے کو اپنی حیاتی کی کلرزہ زمین میں ہریاؤں تلاش کرنے کی خاطر بہت دور تک جانا پڑا۔ وہاں تک — جہاں ایک گاؤں تھا، جب وہ پانچ برس کا ایک بچہ تھا۔ بیک نمبر نہیں تھا۔



(۴)

نارمل سکول گاؤں سے خاصا دور تھا۔
خاکروبولوں کی ٹھنڈی سے پرے۔
جوہڑ کے دوسری جانب
برسیم کے کھیتوں میں سے گذر کر
ریلوے لائن کے پار۔

لیکن پیٹ میں (بسکٹ، بسکٹ - ڈنڈالے کے ڈڈھکٹ) پیٹ میں تنور کی باسی روٹی اور سجرے مکھن کی گرمائی اُس کے بدن کو اس طرح حدت دیتی کہ وہ نارمل سکول تو کیا دس کوس دور شہر تک بھی چلتا جاتا تو اُسے بالکل تھکاوٹ نہ ہوتی۔ اس کی ناک گھراور سکول کے درمیان پھیلی بوؤں اور خوشبوؤں سے اتنی مانوس تھی کہ اگر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تو بھی وہ خاکروبولوں کی ٹھنڈی کے باہر دھوپ میں سوکھتی کھالوں کی بو، جوہڑ پر تیرتی کاٹی کی گیلی باس، برسیم کی ہری خوشبو سونگھتا، گندی نالیوں میں کلکاریاں مارتی بطنوں کی گیس گیس اور ریلوے پھاٹک پر بختی گھنٹی

کی ٹن ٹن سننا، آنکھ چولی کھیلتا سکول پہنچ جاتا۔ ویسے صرف پٹی باندھنے کی کسر تھی ورنہ وہ تو ہمیشہ اپنے آپ میں مگن، ادھ لکھلی آنکھوں سے صرف خوشبوؤں کے سندیسے سونگھتا سکول پہنچ جاتا تھا۔

آج بھی اُس کے نتھنوں نے دھوپ میں سوکھتی مردہ ڈنگروں کی کھالوں کی بو اسے پہنچائی اور وہ تیز تیز چلتا خاکروبوں کی ٹھٹھی میں سے باہر نکل کے کھلے کھینوں میں آگیا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چھوٹی سی پگڈنڈی پر جاتے ہوئے اُس کی عادت تھی کہ وہ اپنی تختی اوس میں بھیگی ہوئی برسیم پر مارتا ہوا چلتا۔ پہلے تو تختی پر اوس کی لکیریں اس طرح نمودار ہوتیں گویا اُس پر کسی نے بھیگی ہوئی چھمک ماری ہو۔ پھر کالی سیاہی سے لکھے ہوئے لفظ اس طرح بڑے ہوتے جاتے جیسے پہلے آنسو سے آنکھوں میں لگا کا جل اپنے گھر سے باہر پھیلنے لگتا ہے۔ سکول پہنچتے پہنچتے تختی پر پٹی گاچی اور سیاہ لفظ اپنی علیحدہ شناخت گم کر بیٹھتے۔ پھر وہ اپنی تختی سکول کے کنویں کے حوض میں ڈبو کر اچھی طرح مل جل کے دھو لیتا (اس حوض میں ایک چھوٹا سا مینڈک رہتا تھا جو ہمیشہ پھدک اُس کی تختی پر آ بیٹھتا اور اپنی گول گول آنکھوں سے اُسے انتہائی سنجیدگی سے دیکھتا رہتا) اس کی تختی کا ایک کنارہ جھڑا ہوا تھا (پھا جو بھرا کے باغ میں سے گزرتے ہوئے وہ تختی پکے ہوئے امرودوں پر پھینکتا، ایک ادھ امرود اُس کی پھیلانی ہوئی جھولی میں آگرتا اور ساتھ ہی تختی بھی — کنارہ اسی طرح ٹوٹا تھا)۔ آج بھی جب وہ کھیتوں میں سے گزر کر اُس بند پر چڑھا جس پر ریلوے لائن تھی تو اُس کی تختی برسیم کے پودوں پر گہری اوس سمیٹ سمیٹ کر نچڑ رہی تھی — ریلوے لائن کالے سانپوں کے ایک مسرت جوڑے کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے آنکھوں پر دونوں ہاتھوں سے سایہ کیا اور دائیں بائیں دیکھا — کہیں گاڑی تو نہیں آرہی؟

پھر وہ لائن کے ساتھ لیٹ گیا اور کان اس کے ٹھنڈے لوہے کے ساتھ لگا دیا — شاں شاں کے شرلاٹے کی انتہائی مدہم گونج، لائن میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ جو صرف کان نے محسوس کی — گاڑی پچھلے سیٹشن سے چل دی تھی۔ اُس نے تختی اور بستہ ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھ پمروں کی طرح پھیلائے کسی بازی گر کی طرح لائن پر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اس مشغلے سے اکتا گیا اور بیٹھ کر ایک پیسے کا ود سکے ڈھونڈھنے لگا جو کل سکول سے واپسی پر اُس نے لائن کے اوپر رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھار ایک پیسے کا سکے لائن پر رکھ جاتا، دوسرے روز آتا تو سکے گاڑی کے پتوں تلے آکے ایک چوڑا بتا شہ بنا ہوتا۔ اس نے اپنے گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں ایک گھرے کے اندر ایسے چپے ہکوں کا ڈھیر چھپا رکھا تھا — کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ اُس گھرے میں کتنا بیش قیمت خزانہ پوشیدہ ہے — مگر آج لائن بالکل خالی تھی۔ اُس نے بہت تلاش کی مگر سکے نہ ملا۔

”ضرور گامے ماپھی نے اٹھایا ہے“ اس نے گامے کو ”کھوتے کا کھر“ جیسی گندی گالی دی اور پھر چار پانچ گول گول پتھر تلاش کر کے لائن کے اوپر ایک قطار میں رکھ دیئے (آج اُس کی جیب خالی تھی۔ جیب خرچ کے دونوں پیسوں سے وہ گاچنی اور کلک خرید چکا تھا) اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے بستہ اٹھایا، اور تختی بغل میں داب کر لائن کے پار اتر گیا۔

دوسری جانب ایک خالی میدان تھا۔ جس میں کہیں کہیں اک کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ عنابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول دینے والے اک۔ اُس نے پھر حسب معمول تختی اور بستہ زمین پر پھینکا اور کوٹھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس پاس لگا۔ دوڑائی، اک کی بڑھیاں دبوچنے کے لئے — لیکن آج میدان خالی پڑا تھا۔ اک کے پودوں پر ایک بھی بڑھیا نہیں اُڑ رہی تھی۔ جہاں ہمہ وقت سفید بالوں والی

یہ روحیں ڈوڈھے کے جسم سے نکل کر چاروں اور پھیلی ہوئی تھیں، وہاں آج
کچھ بھی نہ تھا۔ پودوں پر جیسے ہوا کی ہوئی تھی اور ان کے ڈوڈوں میں پہناں بڑھیا
اپنے سفید بالوں سمیت سو رہی تھیں، باہر نہیں آ رہی تھیں — آندہ ہو کر وہ
تختی اور لبتہ اٹھانے کو تھا کہ اک کے پودوں کے بیچ اسے ایک جسم ہلتا ہوا نظر آیا۔
اُس نے قریب ہو کر دیکھا۔
ایک گدھا تھا۔

اوندھے منہ پڑا ہوا۔

جیسے کچھوا اوندھا ہو جائے تو پھر سیدھا نہیں ہو سکتا۔

(جو ہڑیں بڑے بڑے کھوے تھے جن کے جسموں میں اُس کی مچھلیاں
پکڑنے والی درجنوں کندیاں دفن تھیں — کھوتے کے کھر کھوے؟)



(۵)

وہ اور قریب ہوا، غور سے دیکھا۔

گدھے کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔

”شاید سڑک پار کرتے ہوئے کسی ٹرک تلے آگیا ہے۔“

ٹانگ صرف ٹوٹی ہوئی نہیں تھی

بلکہ گھٹنے سے نیچے بالکل ہی کھلی گئی تھی

(جیسے بیلن میں گنا)

ویسے بھی بہت ہی نحیف اور لاغر

ہڈیاں ہی ہڈیاں۔

پہچان — اُس نے گدھے کو پہچان لیا

(راجے جولاہے کا گدھا جس پر وہ سوت لاد کر منڈی لے جاتا تھا۔)

وہ کبھی کبھار کسمسا کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا مگر۔

کھلی ہوئی ٹانگ میں اب ہڈی نہ تھی۔

ہڈی کے ریزے تھے جن کی
خون آلود چوئچیں گوشت میں سے
باہر آرہی تھیں
اور وہ سیدھا ہونے کی کوشش میں
پھراوندھا ہو جاتا

.....

کچھ فاصلے پر — دو گدھ!
گنخی، لمبی گردنیں آسمان کی طرف —
یوں انجان بنے بیٹھے تھے جیسے —
وہ یونہی چہل قدمی کی خاطر ادھر آنکھوں
اور انہیں اس اوندھے پڑے گدھے سے
کوئی سروکار نہیں
کوئی واسطہ نہیں
کوئی دلچسپی نہیں۔

اس نے ایک کنکر اٹھا کر گدھوں کی جانب پھینکا مگر وہ کبڈی کے کسی کھلاڑی
کی طرح اپنے جسم پچکا کر غچہ دے گئے (ایک لمحے کے لئے پر پھیلانے اور پھر انہیں
سمیٹ کر ویسے ہی بیٹھ گئے۔)

”رحماں جولاہا جانے اپنے گدھے کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے؟“ اُس نے
تختی اور لہنے اٹھایا اور سکول کی جانب چل دیا (اس وقت اُسے معلوم نہ تھا کہ جب
کوئی بھی جاندار ناکارہ ہو جائے تو اُسے لوگ یونہی دیرانوں میں پھینک دیتے ہیں)

تختی حوض میں ڈوبی تو مینڈک کا بچہ پھدک کر اوپر بیٹھ گیا۔ اُس نے اس کی چھوٹی چھوٹی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”مگر رحماں اپنے گدھے کو وہاں کیوں چھوڑ گیا ہے؟“

ایک دوئی دوئی — دو دوئی — تین ایک تین — تین دوئی —
آمنے سامنے کھڑے بچوں نے کندھے اور بازو ہلا ہلا کر پہاڑ سے یاد کئے اور دوپہر
تک اُن کے گلے بیٹھ گئے — وہ بھی اپنا منہ تو ”اک دوئی“ کہنے کے لئے کھولتا
مگر اسے محسوس ہوتا جیسے تمام بچے منہ کھول کر دہائی دے رہے ہیں — ایک
گدھا، گدھا — دو گدھ، گدھ — ایک گدھا — ظہر کی اذان کے ساتھ ہی پھٹی ہو گئی
اور وہ پورنوں سے بھری تختی بغل میں دابے سکول سے باہر آ گیا۔

گاؤں کے راستے میں میلن تھا۔
میدان میں آگ کے پودے تھے۔

اور اُن کے درمیان —

اچھے جولاہے کا گدھا پڑا ہوا تھا۔

مگر اب آگ کے پودوں پر ہوا گنجان تھی،

خالی نہ تھی۔

اُس میں اُن گنت سفید بڑیاں اُڑ رہی تھیں کیونکہ —

ڈوڈوں کے منہ کھل چکے تھے

بڑیوں کے سفید کفن کے سائے میں —

اچھے جولاہے کا گدھا پڑا ہوا تھا

مگر اب —

دو گدھ نہیں،

اُس کے گرد گدھوں کا ایک ہجوم تھا —
 اُن سب کی گردنیں آسمان کی جانب نہیں تھیں۔
 ایک ایسے نقطے کی جانب تھیں جہاں —
 ایک اور گدھ کا دھڑکھائی دے رہا تھا، گردن کے بغیر
 کیونکہ اُس کی لمبی گردن تو گدھے کے لید کرنے والے سوراخ کے اندر گھسی
 ہوئی تھی۔

اور باقی سارے گدھے۔

اپنی باری کے انتظار میں تھے۔

.....

گدھے کی گردن گدھے کی پیٹھ میں سے پھسلتی ہوئی باہر نکلی —
 اُس کی چوہچ میں ایک خون آلود بوٹی تھی —
 ایک جیتے جاگتے جانور کا ماس —
 اور اُس کی گنجی، لمبی گردن —
 خون کی سُرخ میں رنگی جا چکی تھی۔
 وہ گرج بوٹی سنبھالے پچھلے پاؤں چلتا —
 اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں اکٹرا ہوا۔
 پھر اُن میں سے ایک اور گدھ —
 ہجوم سے الگ ہوا —
 گردن سیدھی کئے —
 وہ زخموں کے اُس سُرخ کنوئیں کی طرف بڑھا
 جس کے اندر،

گدھے کا سانس لیتا ہوا ماس،
 آنے والی چوہچ کے ڈر سے —
 کانپ رہا تھا۔
 گدھے کی چوہچ قریب ہوئی،
 گدھے نے اُسے دیکھ کر ہلنے کی کوشش کی — لیکن —
 وہ ہل نہ سکا — وہیں پڑا رہا۔
 اس کی لید کرنے والی جگہ میں سے جیتے ماس کے —
 پیچھے لٹک رہے تھے اور اُن میں سے —
 خون — رِس رِس کر خشک مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔
 گدھے کی گردن گدھے کے قریب پہنچ کر اس طرح لمبی ہونے لگی —
 جیسے دبڑ کی بنی ہوئی ہو —
 پھر اُس نے اپنی چوہچ سیدھی کر کے،
 ماس کی اس خون آلود سرنگ میں داخل کر دی۔
 پہلے چوہچ اندر گئی،
 پھر مہین آنکھیں اور چھوٹا سا سر،
 اور پھر لمبی گردن،
 خون سے رستے ماس میں پھسلتی ہوئی اندر چلی گئی۔
 گدھے نے اپنے لاچار جسم میں
 زور آور کی چوہچ کو آگے بڑھتے محسوس کیا —
 تو وہ غریب
 اس طرح اکٹرا گیا

جیسے مر گیا ہو۔
لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ تو —
آغاز ہے۔

ابھی تو اس چوچ نے پوری طرح اندر جانا ہے۔
اُس کے ماس میں پہنچنا ہے۔
اُس ماس کو اُدھیرنا ہے —
اور —

جس لمحے —
گدھ کی چوچ نے اُس کے اندر سے
ماس کا ایک نوالہ نوچا —
تو گدھا ترپا —
ایسے ترپا کہ —

گدھ کا باہر والا جسم کا حصہ بھی گدھے کے ساتھ دوہرا ہو گیا
لیکن اب —

اب تو نوالہ چوچ میں تھا (زور اور ایک مرتبہ اگر نوالہ چھین لیں تو وہ بے شک
دوہرے ہو جائیں چوچ نہیں کھولتے)

کچھ دیر بعد —

گدھ کی گردن پھسلتی ہوئی باہر نکلنے لگی —
اور اُس کی گنجی گردن سیاہی مائل خون میں لتھڑی ہوئی تھی
اُس کی مہین آنکھوں پر خون کے قطرے تھے اور
چوچ میں — گوشت کا ٹکڑا — جس میں

شاید ابھی جان باقی تھی
جو نا معلوم سا کپکپا رہا تھا —
ایک اور گدھ آگے آیا۔ — — —

گدھے کی آنکھیں ایسے پکھیرؤں کی مانند تھیں جن کی طرف موت کا جال
بڑھتا ہے تو وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی پتھرا جاتے ہیں۔ اُسے بہت بعد میں معلوم
ہوا کہ اُس روز — اُس بڑھیوں سے بھرے میدان میں — آگ کے پودوں
تِلے اُس کے سامنے بندے کی زندگی کا مکمل ٹائٹل کھیلا جا رہا تھا۔ اس سے
بڑی اور کوئی سچائی نہ تھی — گدھوں کا ہجوم اور ایک جاندار — گدھے کی پیٹھ
میں سے رستے بہو کے سُرخ بلبے — گدھوں کی چوچوں میں لہو سے لتھڑی
بوٹیاں — سرخی میں رنگی گردنیں — گدھوں کے ہجوم سے شروع ہو کر گدھے
کی پیٹھ تک پہنچتا ہوا سُرخ اور گیلداراستہ — موت کا — خوف کے میاں بگولے
اس کی آنکھوں میں ناچے اور وہ تھرتھرت کر کانپنے لگا — یہ گدھا اتنے عذاب کیوں
تہہ رہا ہے؟ — مسجد والے مولوی صاحب کا دَب کہاں ہے جو بڑا مہربان
ہے جو رحم کرنے والا ہے — اگر یہ گدھ میری طرف آجائیں اور میری پیٹھ میں
گردنیں گسیڑ کر میرے اندر کی بوٹیاں نوچ لیں تو؟ — اس نے پہلے ایک بڑا
سُکراٹھا کر گدھوں کے ہجوم میں پھینکا — اس مرتبہ انہوں نے پُر پھیلانے کی
دست بھی گوارا نہ کی، بس ادھر ادھر ہو گئے — (کیونکہ اُن کے پیٹ مہرے
نے تھے) اُس نے مزید چار پانچ کنکرا اُن کی جانب پھینکے مگر وہ لا پرواہ بیٹھے
ہے۔ پھر وہ تختی کا دستہ مٹھی میں مضبوطی سے بچھنے کو گدھوں کے ہجوم میں گھس گیا۔
”کھوتے کے کُفر — کھوتے کے کُفر —“ وہ چیخنے لگا —
تختی گدھوں کے پروں پر پڑتی اور پھسل جاتی اور وہ وہیں اطمینان سے

یہ گدھ میری پیٹھ میں چونچیں گھسیڑ کر میری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔
 اُس نے تختی وہیں پھینکی اور اندھا دھند بھاگتا ہوا میدان سے باہر آگیا۔ اور پھر
 اس میدان میں آگیا؟
 نہیں۔
 ابھی نہیں۔
 ابھی تو گدھوں کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔
 ابھی تو آغاز ہوا تھا۔
 ابھی تو ان گنت گدھ
 اس کی حیات کے آسمان پر
 اپنے بد صورت پر بچھلا کر
 اُسے سیاہ کریں گے
 ان گدھوں کی شکل۔

بیٹھے رہتے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ گدھ وہاں سے اڑ جائیں مگر وہ اپنی
 جگہ سے شس سے شس نہ ہوئے۔ اُس نے گدھے کی جانب دیکھا۔ ایک گدھ
 کا دھڑ گردن کے لپیٹ گدھے کی پیٹھ میں اس طرح جڑا ہوا تھا جیسے وہ
 دونوں اسی طور پیدا ہوئے تھے۔ گدھا اور ایک دھڑ۔ وہ بھاگتا ہوا
 اُن کے قریب گیا اور گدھ کے دھڑ کو پوری قوت کے ساتھ اپنی تختی سے
 کوٹنے لگا۔ مگر کہاں! اندر گدھے کے اندر چونچ نے نوالا نوچ رکھا
 تھا وہ کیسے کھلتی۔ وہ پاگلوں کی طرح گدھ کے دھڑ کو تختی مارتا رہا مگر اُس
 نے گردن باہر نہ نکالی۔ اور بالآخر جب گردن باہر آئی تو چونچ میں سُرخ
 بوٹی تھی۔ گدھا اب اتنا نحیف ہو چکا تھا کہ اپنا ماس کا ٹٹی چونچ کو محسوس
 کرنے کے باوجود بس وہیں پڑا رہا، حرکت کئے بغیر،
 ایک گدھ نے اُس کی پیٹھ پر چونچ ماری (کیونکہ اب اُس کی باری تھی اور
 وہ اُس کے اور گدھے کے درمیان حائل تھا) اُس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا
 گدھ گردن لامبی کئے انتظار میں تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر چونچ آگے
 بڑھائی۔ یہ گدھ میری پیٹھ میں چونچیں گھسیڑ کر میری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے
 اُس نے تختی وہیں پھینکی اور اندھا دھند بھاگتا ہوا میدان سے باہر آگیا۔



اُن گدھوں کی مانند نہیں تھی
 جنہوں نے احمہ کے گدھے کو سُرخ چیتھڑے بنایا تھا مگر —
 انہوں نے بندے کے ساتھ سلوک دیا ہی کیا۔
 اُس کا جیتا جاگتا ماس کھایا۔
 اُس کے لبوسے اپنی گردنیں سُرخ کیں۔
 بندے کو پہلے پہل وہ گدھ دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ —
 اپنے جیسے ہی بندے دکھائی دیتے تھے —
 اُس پاس کی خلقِ خدا کی طرح —
 اشرف المخلوقات —
 اس وقت تو وہ صرف دوست تھے —
 رشتے دار۔ سرکاری افسر۔ سیاستدان۔ کاروباری
 اور ادیب تھے —
 گدھ نہیں تھے۔
 گدھوں کا روپ تو انہوں نے بعد میں دھارا
 وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ۔
 نرم پردوں میں سے سان پر لگی چھری جیسی چونچیں نکلیں۔
 اور چمکیں۔
 لیکن تب تک وقت گزر گیا تھا ناں؟
 کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
 انہوں نے اُسے نوچ ڈالا
 دیں، دوستی اور رشتے داری کے

کند ٹگوں سے اُسے —
 ذبح کر ڈالا۔

اُس کا بدن ٹھنڈا ہونے لگا
 اُس نے دل میں روشن سائیں کے مچ سے کہا
 ”اپنا الاؤ میرے پاؤں کی جانب بھیج
 پالا میرے اندر کو رخ کرنے کے لئے پھر زور لگا رہا ہے“
 سائیں کے مچ نے ہمیشہ کی طرح پالے کا راستہ روک لیا اور پوچھا —
 ”کب تک؟“
 ”مزید کب تک؟“
 بندے نے کہا
 ”بس تھوڑی دیر اور...“
 ”اب زیادہ دیر نہیں —“
 اُس نے دیرانے میں کھڑے اپنے بلی ٹنڈ کی جانب دیکھا — وہ ہمیشہ
 کی طرح بازو پھیلائے چپ کھڑا تھا — کسی صلیب کی مانند —
 بندہ دل ہی دل میں ہنسا
 ”میں تو اُس جہان میں اپنی صلیب آپ اُٹھائے پھر اموں — صرف
 اپنی نہیں — ساری مخلوق کی صلیبیں بھی میری کمر پر لاد دی گئیں۔ پھر اس
 دیرانے میں لئے ایک اور صلیب کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”یہ ٹنڈ درخت اگر آگ کا پودا ہوتا — اس کے ساتھ ڈوڈے
 لگتے — ڈوڈوں میں سے لاکھوں بُڑھیاں جنم لیتیں اور اس میدان کے اگلے

میں نیم پاگل فقیروں کی طرح اُڑنے لگتیں۔ لیکن۔ لیکن بڑھیاں تو صرف اُن میدانوں پر اپنے سفید بال کھولتی ہیں جن کے درمیان اچھے جولاہے کے گدھے پڑے ہوتے ہیں۔ جہاں گدھوں کے ہجوم ہوتے ہیں۔ نہیں یہ ٹنڈک کا پودا نہیں بننا چاہیے۔ اسی طرح بہتر ہے خشک اور پتوں پھولوں کے بغیر۔ ایک صلیب کی طرح۔

ذہن کی زمین میں چلتا ہل۔ جو چند لمحوں کے لئے باہر آگیا تھا۔ پھر نیچے اُترا اور گزرے زمانوں کی گہرائی میں کھسک کر انہیں دیکھنے لگا۔

گاؤں اور دریا کے درمیان بیدا تھا۔

شیشم۔ توٹ۔ جھڑ بیریاں، سفید سے اور کمریر کے جھنڈ۔ گنجان درختوں تلے گیدڑوں، بھیڑیوں اور سوڑوں کی پناہ گاہیں پوشیدہ تھیں۔ ویسے تو بابا جہان خاں ایک مرتبہ قسم کھا کر یہ کہہ چکا تھا کہ اُس نے کچھ برس پیشتر بیلے میں ڈنگر پر اتارے ہوئے ایک شیر کو بھی دیکھا تھا، مگر کسی نے بھی اس چشم دید شیر کی موجودگی کو سنجیدگی سے نہ لیا کیونکہ بابا کے ”کچھ برس“ جانے کتنے تھے۔ بیس، چالیس، ساٹھ۔ اس کی بے حساب عمر کے باسے میں کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ ساٹھ، اسی، سو یا اس سے زیادہ۔ وہ سکول سے بیدھا گھر واپس آتا اور کوٹھڑی میں گھس کر اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اپنے چپٹے سکوٹ کے خزانے کی گنتی میں مصروف ہو جاتا۔ گھر سے میں ایک اور سکہ ڈالتا اور پھر سوکھی روٹی کے دو چار ٹوالے لسی کی مدد سے حلق سے اتار کر بیلے کی جانب چل دیتا۔ بیدا اُس کا بیلی تھا اور وہ بیلے کا بیلی۔ بیلے کے بیچوں بیچ ایک کچا راستہ تھا جو ہمیشہ دھول سے اٹا رہتا۔ گاؤں کے لوگ مولتی حیرانے کے لئے دریا کے دوسرے کنارے جاتے تو اس کے راستے سے

اُن کا گذر ہوتا۔ راستے کی اس تختی پر جانوروں اور انسانوں کے پاؤں کے پوڑنے لکھے جاتے مگر یہ پوڑے کبھی پکے نہ ہوتے، اُن پر سدا سننے قدم اور سُموں کے نشان ظاہر ہوتے رہتے۔ شہر کی عدالتوں میں تاریخیں بھگتنے والے بھی اسی راستے کو اختیار کرتے اور دریا کے کنارے پر پہنچ کر کرملی ملاح کی کشتی کے ذریعے پار اُترتے۔ وہ بھی اس راستے پر چلتا مگر کچھ دور جا کر شیشم کے ایک جھرمٹ میں سے دائیں طرف ہو کر بیلے کے اندر داخل ہو جاتا۔ ادھر کسی راستے کا نام و نشان نہ تھا، زمین کی تختی بالکل صاف اور کوئی تھی، بس کمریر اور جھڑ بیریوں کے جھنڈ تھے۔ دوب اور گھاس پھونس۔ یا کہیں کہیں مرے ہوئے پکھرو، ہزاروں چوٹیوں میں دفن، دور سے ہلتے ہوئے معلوم ہوتے جیسے اُڑنے کا چارہ کر رہے ہوں۔

اسوج اور کاتک کے مہینوں میں کمریر پر پیازی پھول کھلتے۔ سائے بیلے میں انگاروں کی چادر بچھ جاتی۔ پھولوں سے ڈیلے بننے اور پھر ڈیلے پیچوٹوں میں بدل جاتے۔ سرخ رنگ کے یہ پیچوٹے بیروں سے بھی زیادہ ذائقہ دار لگتے آج بھی اُس نے جیب میں بہت سائے پیچوٹے بھر لئے۔

بیلے میں ایک ایسا مقام بھی تھا جہاں درختوں کے سائے اتنے گھنے تھے کہ اُن کے نیچے بھری دوپہر میں بھی ایک نیم تاریکی خوابیدہ رہتی۔ وہ اس جگہ پہنچ کر ماتھے سے پسینہ پونچھتا اور تختی اور بستہ زمین پر رکھ کر گھاس پر لیٹ جاتا۔ یہ اس کا گھر تھا۔ اُس کا اپنا گھر۔ جس میں اور کسی کا عمل دخل نہ تھا۔ اس گھر میں ماں باپ، بہن بھائی کوئی بھی اس کا شریک نہ تھا۔ سفر کی تھکاوٹ کا بوجھ اُتارنے کے بعد بھی وہ شیشم کے درختوں پر چڑھ کر مینافوں کے گھونسلے تلاش کرتا، جگلی چوہوں کے بلوں میں پانی ڈال کر اُن کی بھاگ دوڑ کا تماشہ دیکھتا ایک مرتبہ ایک بل میں سے چوہے کی بجائے سانپ کا سر نمودار ہو گیا اور وہ تختی بستہ وہیں چھوڑ کر گاؤں

کر ملی نے پھر پانی پر نظریں بچھا دیں — یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ عمر رسیدہ
ملاح بھی رسد ہاتھ کی طرح پانیوں کی بولی سمجھتا ہے — پانی کی آواز سن سکتا ہے
قدرت کے سامنے بھی پانیوں سے پوچھ لیتا ہے اور اپنی آپ بیتی اپنے سامنے
بہتے ہوئے جاندار کو سنا لیتا ہے — سوال جواب کر سکتا ہے۔

اُس کے سامنے کر ملی کا مچھلی پکڑنے کا جال ریت میں گاڑے دو شہتیوں کے
درمیان اس طرح تنا تھا کہ اُس کے سوراخوں میں سے دریا کا پانی جھانکتا دکھائی
دیتا تھا۔ وہ انگشت شہادت سیدھی کر کے جال کے سوراخ گننے لگا۔ ایک —
دو — تین — چار — کبھی کبھار سورج کی چمک پانیوں سے الگ ہو کر سوراخوں
میں سے اُڑ آئی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ گیلی مہتابی کے
پھسپھے شراروں ایسے تارے ناپختہ اور دھوپ کی سفید مچھلیاں پورے منظر میں تیرنے
لگتیں۔

سات سو اکیاون سوراخ گننے کے بعد وہ گنتی بھول گیا مگر اس دوران دوپہر
ڈھل چکی تھی، شام ہونے کو تھی۔ سورج آسمان سے اُتر کر دریا کے دوسرے
کنارے پتیل کے ایک دیکتے تھال کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے سامنے
جال تھا اور جال کے سوراخوں میں بھنسا ہوا سورج کا سرخ بتاشرہ،
”ہاچا“ اُس نے آہستہ سے کر ملی کا کندھا ہلایا۔ سورج جال میں بھنس
گیا ہے۔ آؤ جلدی جلدی جال سمیٹ کر اُسے قابو کر لیں۔
کر ملی اُس کی یہ بات سن کر ہنسا — اور ہنسا رہا۔

”بتا — اے سچ کے پیغمبر —“ کر ملی پانی پر جھک گیا۔ کبھی سورج یوں
بھی قابو میں آتے ہیں؟“ اُس نے اپنا کان دریا کی جانب کیا اور آنکھیں بند کر لیں
جیسے جواب کا منتظر ہو — دریا بوڑھے سانپ کی طرح لیٹا ہو لے ہو لے

بھاگ گیا تھا) اور اگر کوئی بھولا بھٹکا خرگوش اُدھر آ لگتا تو اُس کے پیچھے دوڑ لگا
دیتا — ان مشاغل سے فارغ ہو کر وہ اطمینان سے تختی لکھنے بیٹھ جاتا اور جوہی
سورج غروب ہونے کو آتا وہ اپنا گھر چھوڑتا — اور دوسروں کے گھر واپس آ جاتا۔
اُس روز بھی وہ اپنے اس گھر میں بیٹھا تختی لکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ پہاڑے بھی یاد
کر رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے کا کریر اس طرح ہلنے لگا جیسے بھونچال آرہا ہو۔
درختوں میں سوئے ہوئے پکھرو پھڑپھڑاتے ہوئے شور مچانے لگے۔ کچھ دیر بعد دو
کالے سور کریر کی جھاڑی میں سے لوٹ پوٹ ہوتے باہر آ گئے اور اپنی کیرپہ النظر
تھو تھنیوں سے آپس میں بھرنے لگے — دہشت کے مارے اُس کی آنکھوں کی
پتلیاں پھیل گئیں اور اس کا جسم کا ہنسنے لگا۔ اس کی نظریں سوراخوں پر ہی جمی رہیں
اور اُس نے آہستہ سے اپنا بستہ اٹھایا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ دریا کے کنارے
پر پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح
چل رہا تھا۔

کر ملی ملاح اپنی جھکی کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اس کی نظریں دریا کی
سطح پر پچی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے ملاح کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ کر ملی نے
حقے کا ایک طویل کش کھینچا اور بولا: ”چاچا بھی ساتھ ہے؟“
اُس نے سر ہلایا۔

”دوسیر کا سر ہلاتے ہو اور چٹانک بھر کی زبان نہیں ہلا سکتے؟“ کر ملی نے
اُس کی کمر تھکی اور ہنسنے لگا۔

اُس نے کر ملی کو بیلے میں سوراخوں کی کشتی کا قصہ سنایا اور پھر چپکا بیٹھ گیا۔
”یہیں بیٹھے رہو بیٹا — شام کو دونوں چپا بھتیجا اکٹھے ہی گاؤں کو لوٹ
چلیں گے۔“

شوکتارہا۔ بیلے میں سے کسی گیدڑ کی آواز سنائی دی۔

”نہیں۔ ایسے نہیں“ جھٹکے کی نال زبان تلے دابہ کرتی جانے کس سے مخاطب ہوا۔ اگر سورج یوں قابو میں آجائیں۔ گرفت میں آجائیں تو آج میری تاریک جھگی میں روشنی ہی روشنی ہوتی۔ کونے کھدروں میں سورج ہی سورج چمکتے“

اُس شب جال کے سوراخوں میں سے جھانکتا سورج اُس کے ذہن میں پناہ گزین ہو گیا۔

اس کا چاچا گاؤں کی بیٹھک سے واپس آیا تو وہ کھیس میں منہ دئیے سو رہا تھا۔ کھیس کے اندر روشنی ہی روشنی تھی، اُس سورج کی جسے وہ آج جال کے سوراخوں میں قید کر کے پکڑ لایا تھا۔ آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے کھیس منہ سے ہٹا کر پوچھا۔

”چاچا کیا میں کبھی سورج کو حاصل کر سکتا ہوں؟“

چاچے نے حیرت زدہ ہو کر اُسے دیکھا اور ہولے سے بولا۔

”سیانے لوگوں کا قول ہے کہ اگر بندہ جی لگا کر محنت کرے، ارادہ مضبوط

رکھے تو وہ اس جہان کی ہر شے کو حاصل کر سکتا ہے“

”ہر شے کو چاچا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اگر میں خوب محنت کروں، پوری سولہ

جماعتیں پاس کر لوں اور میرا ارادہ نمبرداروں کی حویلی سے بھی اونچا اور مضبوط ہو تو

کیا میں سورج کو حاصل کر لوں گا؟“

چاچا اُس کی چار پائی پر بیٹھ گیا اور اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”میں تو کم عقل ہوں۔ مجھے اُن باتوں کا کیا پتہ، پر سیانے تو یہی کہتے ہیں۔ ہو سکتا

ہے اس طرح بندہ سورج کو بھی حاصل کر لیتا ہو“

اس نے دوبارہ کھیس منہ پر تان لیا مگر اُسی لمحے چاچے نے اچانک کھیس کا کونہ پکڑا اور اُس کے جسم سے اُتار پھینکا۔ ”تم کہاں گئے تھے آج؟“ یہ خون کیسا ہے؟“

اُس کا بستر خون سے نچڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے لباس کو دیکھا تو وہاں بھی خون ہی خون تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اُس کا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے ماسٹر کا بید اُس پر برسے والا ہو، پتہ نہیں چاچا۔ میں تو آج بھی ہمیشہ کی طرح بیلے میں ہی گیا تھا۔ بے شک قسم لے لو۔ کر ملی ملاح سے پوچھ لو“

”بیلے میں۔ کہیں جوہڑ میں سے تو نہیں گزرے؟“

اُسے یاد آیا کہ گاؤں لوٹتے ہوئے کر ملی اور وہ جوہڑ میں سے گذر کر آئے تھے۔ اپنے کپڑے اُتار کر انہوں نے سر پر رکھ لئے تھے۔ جوہڑ کے اوپر سے ہو کر گاؤں آتے تو فاصلہ زیادہ پڑتا۔

”ہاں چاچا“ اُس نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا۔ ”میں جوہڑ میں سے گذرا تھا“

چاچے نے فوراً اُس کے سائے کپڑے اُتار دیئے اور پھر اُس کے ننگے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ ”ان کے اندرونی حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس کی ہتھیلی تلے ایک ایسا نرم اور بھلجا ماس آیا جو اُس کے بیٹے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اُسے جلدی سے گھسیٹا ہوا دالان میں مدھن دیئے کی ناکافی روشنی تلے لے آیا۔ اُس نے جھک کر غور سے دیکھا۔ غباروں کی طرح پھولی ہوئی دو جونکیں اس کے بیٹے کا لہو پی پی کر حواس باختہ ہو رہی تھیں۔

— زور آور کی طرح صرف پیٹ بھر لینے سے اُن کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اپنی

خصلت سے مجبور انہوں نے اتنا خون چوسا تھا کہ وہ اُن کے اُبھرے ہوئے پیٹ میں سمانے کی بجائے اُن کی پیٹھوں میں سے خارج ہو ہو کر پکے فرش پر پٹک رہا تھا۔ چا پے نے پہلے جونکوں کو انگلیوں کی مدد سے کھڑچا اور پھر مٹھی میں قابو کر کے انہیں اُتار پھینکا۔

اُسے اب معلوم ہوا کہ شام کے بعد اُس کی رانوں کے اوپر مدھم سی جلن کیوں ہو رہی تھی۔

دونوں جونکیں کچے فرش پر دھیرے دھیرے ہل رہی تھیں۔ اُن کے جسموں میں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُن کی جسامت پہلے سے آدھی رہ گئی اور ان کے ارد گرد خون کا ایک چھوٹا سا جوہر بن گیا۔

”ان پھولی ہوئی جونکوں میں میرا خون ہے۔“ اس خیال سے اُس کا چہرہ توری کے پھول کی طرح زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑھئیوں کے سفید بادل تیرنے لگے (اس وقت تک اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کے خون سے پھولی ہوئی جونکیں بھی حیاتی کے نائٹک کا ایک اور منظر ہیں۔ گدھ اور اُس کا اندر۔ جونکیں اور اس کا خون!)



(۷)

دوسرے گدھ نے پوچھا: ”وقت آگیا ہے۔ یا نہیں؟“

پہلے گدھ نے نیچے دھیان کیا۔ وہی بندہ۔ وہی ٹنڈ منڈ درخت اور اُن کے چاروں اور اکلا پے کا راج۔ ”نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا۔“

دوسرے گدھ نے گردن میں ہل ڈالتے ہوئے غصے سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ لیکن وقت کب آئے گا؟ ابھی تو وہ اکیلا ہے۔ اس بیابان میں بے شک دیہاتی دیتا ہے، اس کا گلا بیٹھ جائے مگر اُس کی آواز پر کوئی دھیان نہ دے گا اس لئے کہ یہاں ہے ہی کوئی نہیں.... لیکن کل کلاں اگر اُس کے ساتھی آئے تو؟

”ساتھی؟“ پہلا گدھ مکاری سے چیخا۔ ”ارے احمق گدھ اگر اُس جہان میں اس کا کوئی ساتھی ہوتا تو وہ اس بیابان میں کیوں اکھڑا ہوتا؟ یہ اکیلا ہے۔ سدا اکیلا ہے گا۔ اس کے لئے یہاں تک کوئی نہیں پہنچے گا۔“

لیکن اس جوہڑ میں سے اُس کے علاوہ اور لوگ بھی تو گزرتے ہیں اور جوئیں اُن کے ماس پر نہیں چلتیں؟۔ شاید اُس کے جسم میں کوئی ایسی باس تھی جو جوئوں کو پاگل کر دیتی تھی اور وہ صرف اُسے ہی چٹتی تھیں۔ لیکن یہ جوئیں گاؤں کے جوہڑ میں پائے جانے والی جوئوں کی طرح دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ وہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بے شک جسم پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر دیکھ لو، تم انہیں تلاش نہیں کر سکتے، بلجے ماس میں انگلی نہیں کھینتی۔ بس بدن میں ہلکی سی جان ہوتی رہتی ہے اور تمہاری حیاتی کا لہو آہستہ آہستہ چوسا جاتا ہے.....

چاچے نے اُسے زمین گہن رکھ کر شہر بھیجا۔ ایک بیگمہ اور ایک جماعت۔ اس طرح اُس نے سولہ جماعتیں پاس کر لیں (زمین ابھی تک گہن رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اب کیا فرق پڑتا تھا؟۔ اس بیابان میں) چاچا جانے کن سیانوں کی بات کرتا تھا کیونکہ اُس نے تو جی بھر کے محنت بھی کی، ارادہ بھی مضبوط رکھا مگر سورج حاصل کرنا تو الگ رہا وہ تو اس جہان کی کمینی ضرورتوں کو بھی حاصل نہ کر سکا روٹی، کپڑا اور مکان ایسی کمینی ضرورتیں۔ خالی ڈگری تو ایک ایسا بے مراد سا کاغذ ہے جو صرف ہلدی اور نمک باندھنے کے کام ہی آ سکتا ہے۔ جب تک اُسے رشوت، مکر، جھوٹ اور خوشامد کے پر لگا کر بے ضمیری کی پھونکیں نہ ماری جائیں یہ کاغذ نہیں اڑتا۔۔۔۔۔ محنت، قابلیت اور پچ تو اُس جہان میں پتھر کے پڑتے جنہیں انسان جسم کے ساتھ باندھ لے تو ڈوب سکتا ہے، اڑ پھر بھی نہیں سکتا۔ ایک ہی جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ بالکل تنہا۔ لیکن جب اُسے یہ سب معلوم ہوا تو وقت گزر چکا تھا۔

اُن دنوں اُس کا وجود سالم تھا۔۔۔۔۔ اُسے اپنی عقل اور قابلیت پر بھروسہ تھا۔

اُسے یقین تھا کہ وہ پرواز کر سکتا ہے۔ اُس نے مقابلے کا امتحان دیا، اونچی سرکاری نوکریوں کے لئے۔ نتیجہ نکلا تو وہ کامیاب ہونے والے پہلے دس نوجوانوں میں شامل تھا۔ لیکن ابھی اُس کے اور سرکاری نوکری کے درمیان انٹرویو کا گہرا کنواں تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ۔۔۔

”سوالوں کے وہی جواب دینا جو انٹرویو لینے والے سننا چاہتے ہیں۔ وہ جو کہیں کہنا سچ کہتے ہو۔ درمیان میں آپ نے درست کہا جناب، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سرکار کا وظیفہ پڑھنا۔ وارث شاہ، بلجے شاہ، میاں محمد اور شاہ حسین کا ذکر بھولے سے بھی نہ کر بیٹھنا۔ گلے میں سارتر، جوائس ایلٹ اور ہکسے کی مالا پہن کر بیٹھنا۔ مذہب پر بحث مت کرنا۔ اور بنیادی بات۔ اندر کا جمید مت کھولنا۔ سچ کے پھیرو کو قید ہی رہنے دینا“ وہ انٹرویو دینے کے لئے دروازے میں سے داخل ہوا تو دوستوں کے تمام مشورے بھول گیا اور صرف چاچے کا کہا یاد رکھا۔ اگر انسان محنت کرے، ارادہ مضبوط رکھے۔۔۔

انٹرویو شروع ہوا تو اُس کے سامنے چار بندے تھے، جوں جوں وقت گذرا اور اُس نے صرف سچ اور صرف سچ کہا تو اُن بندوں کا لباس پروں کی صورت پھڑپھڑانے لگا، گردنیں لمبی اور گنچی ہونے لگیں، ناک اتنے نوکدار ہوتے گئے کہ بالآخر چونچیں بن کر چمکنے لگے۔ وہ چاروں اب گدھ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سوال نہیں پوچھ رہے بلکہ اُس کی بوئیاں نوچ لینے کی جستجو میں ہیں۔ ایک گدھا، گدھا۔۔۔ چادہ گدھ، گدھ نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا۔ اگلے ماہ اُسے ایک پرائمری سکول میں ٹیچر مدرس کی نوکری مل گئی (دو سو روپے ماہوار میں وہ چاچے کی زمین گہن سے کیسے چھڑاتا؟)

یہ گدھوں کا پہلا حملہ تھا۔ حیاتی کے جوہڑ میں سے گزرتے ہوئے چمٹنے والی

والی پہلی جونکیں۔

سفید دیوار !

ایک سفید دیوار !

دیرانے میں ایک نئی سویر کا ظہور ہوا —
تو بندے نے دیکھا کہ اُس کے سامنے
زمین سے شروع ہو کر عرش تک

ایک دیوار کھڑی ہے،

ایک سفید دیوار۔

بندے کا بدن —

پسینے میں نہا گیا

”یہ دیوار یہاں بھی آپہنچی ہے؟“

لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔

یہ انہونی بات ہے —

اس دیرانے میں مجھے

کسی دیوار کی ضرورت نہیں —

انہی دیواروں سے بھاگ کر تو میں

یہاں آیا ہوں“

زمین کی کوکھ میں سے پھوٹ کر نکلتی ہوئی

عرش کے سینے میں گر ٹی —

ایک دیوار —

ایک سفید دیوار —

”یہ یہاں بھی آپہنچی ہے؟“ بندے کو یقین نہ آیا۔ یہ تو میرے چھوٹے سے کمرے
میں بقیہ تین دیواروں کے سہارے کھڑی تھی، دن رات مجھے اپنی سفید اندھی آنکھوں
سے دیکھا کرتی تھی۔ اُس جہان میں تو یہ میری دوست تھی۔ لیکن اِس دیرانے میں تو
مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہے — اب کون سے
راستے روکنا چاہتی ہے؟

دو چار پائیاں، ایک ٹب شلیف اور گھر گھر مہتی کا سارا سامان اُس چھوٹے سے
کوٹھڑی نما کمرے میں میرے چاروں طرف بکھرا ہوتا تھا — رات کو آنکھیں بند
کرتے ہوئے یہ سفید دیوار آخری صورت ہوتی جو دکھائی دیتی (بقیہ تین دیواروں
میں دروازوں اور کھڑکیوں کے زخم تھے — تختی بالکل صاف ہو تو اُس پر خیالوں
کے پورے لکھے جاسکتے ہیں) اور صبح آنکھ کھلتی تو بھی یہی سفید کفن چادر دکھائی
دیتی۔ میری گھر والی کو جانے کیسے خبر ہو جاتی کہ میری آنکھوں سے نیند کے پھیرواڑے
چکے ہیں، میں جاگ چکا ہوں اور اُس کا منہ ہائی فائی کے ایک سپیکر کی طرح کھل جاتا۔

”آپ کی تنخواہ میں گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا

بچوں کے لئے دودھ کب تک ادھا آئے گا —

چینی بھی چاہیے۔

سر دی کی شدت — بچوں کے لئے

کم از کم چار سو میٹروں کی ضرورت ہے۔

خواہ سفید چٹری والوں کی اُترن ہو — تب بھی

پچاس روپے سے کم میں نہیں آئیں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

بہن کی شادی ہے — میری بہن کی
اُسے جوڑا بھی دینا ہے۔

میں مشقت کرتے کرتے کمزور ہو گئی ہوں۔
بڑا کڑے طاقت کے ٹیکے لکھ کر دیئے ہیں۔
وہ بھی چاہئیں۔

پچاس روپے کیٹی کے بھی دے دیں — آج ہی،
گھر واپسی پر سوچی لے کر آنا،
تین ماہ سے کوئی میٹھی چیز نہیں پکائی
بچے ضد کرتے ہیں۔

اس ماہ مجھے کم از کم تین سو روپے جائیں۔
(مجھ سے بھی کوئی پوچھ لے کہ مجھے کیا چاہیے!)
دیوار کی طرف کیا دیکھتے ہو! — میری طرف دیکھو
میں کوئی پاگل تو نہیں جوں
بک بک کر رہی ہوں؟
سُن رہے ہو؟

تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔
کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟
سکول سے واپسی پر چارپائی پر بیکار پڑے بیٹے ہو
بس کتابیں پڑھتے بیٹے ہو۔

کتابیں! — میری سونئیں — تمہاری سگی!
کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟

بس سٹاپ کے سامنے بیٹھا پان سگرٹ والا بھی —
تم سے زیادہ کمائی کر لیتا ہے
تم بس سٹاپ پر —
جواب کیوں نہیں دیتے؟
سفید دیوار کی طرف ہی دیکھتے جاتے ہو۔

جواب کیوں نہیں دیتے؟
تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح بولتی رہوں گی، بولتی رہوں گی
اور پھر بالآخر خاموش ہو جاؤں گی؟
میں خاموش نہیں ہوں گی۔
بولتی رہوں گی۔

اگر گھر والی کو شریفوں کی طرح رکھ نہیں سکتے تھے
تو شادی کیوں کی تھی؟
(شادی میں نے کی تھی؟)
بچے کیوں پیدا کئے تھے؟
(ہاں! میں قصور وار ہوں۔)

سنو، وہ میری جیسی ہی نصیبوں جلی ہوتی ہیں جو
بچوں سمیت

نہروں میں ڈوب مرتی ہیں۔
(کچھ میرا بھی خیال کرو —

میں کہاں جاؤں؟
میں کہاں ڈوب مروں؟)

وہ جبرے سختی سے بھیجنے سفید دیوار کو تکتا رہتا۔ بیک گردنڈ میں گھروالی کی پٹکار اور۔ سامنے سفید دیوار۔ وہ آنکھیں جھپکے بغیر سفید دیوار کی طرف دیکھتا رہتا اور تھوڑی دیر کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے گھروالی کی آواز کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کے کانوں میں پہنچنے سے پیشتر کہیں راستے میں ہی گم ہو گئی ہے۔ چونچوں کی طرح کھبتی لعن طعن کی اذیت کہیں دور رہ گئی ہے۔ اور بالآخر بندے کی آنکھیں اس کے چہرے سے الگ ہو کر سفید دیوار کے ساتھ جا چکی ہیں۔ وہ وہیں چارپائی پر ہی لیٹا رہتا مگر اس کی آنکھیں سفید دیوار پر چپکی رہتیں۔ اور یوں اس کی اپنی ہی آنکھیں اسے دیکھنی لگتیں۔ دیوار کی سفید سکمرین پر گئے زمانوں کی مورتیں ایک فلم کی طرح حرکت کرنے لگتیں۔ طرح طرح کی من کو بھانے والی مورتیں۔ ان دنوں کی جب اسے ابھی چونکیں نہیں جھپٹی تھیں۔۔۔۔۔ گدھ اس کے ماس کے بھوکے نہیں ہوئے تھے۔ گھروالی کی پٹکار گہرے سمندروں میں ڈوب جاتی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تتلی ہولے سے بیٹھ جاتی۔ وہ سب کچھ بھول جاتا، جونکوں کی جلن اور گدھوں کی چونچیں۔ سفید دیوار پر لگی اس کی اپنی ہی آنکھیں اس کے وجود پر ایک اور دن کے لئے زندگی کی پھونک مار دیتیں۔

لیکن اس دیرانے میں یہ سفید دیوار کہاں سے آکھڑی ہوئی؟ مجھے تو اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں کوئی آواز نہیں، کوئی لعن طعن اور پٹکار نہیں۔ یہاں تو میں بالکل اکیلا ہوں۔ لیکن نہیں یہ بھی سچ نہیں کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ گھروالی یہاں بھی اس کے آس پاس سانس لیتی تھی کیونکہ وہ یقیناً اس وقت سوچ رہی ہوگی۔ وہ سوچ رہی ہوگی کہ کتے کے بچے نے میری اور بچوں کی زندگی برباد کر دی ہے اور اب چلا گیا ہے۔ سو، پھر وہ کیونکر اکیلا ہو سکتا

تھا۔ وہ اس سے دامن بچا کے کہیں بھی نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے اب تو سانس لینے دو۔ میرے پھیپھڑوں کی طرف آنے والی ہوا کا راستہ نرو کو۔ اگر تم میرے جسم پر پنکھے کی ٹھنڈی ہوا کی طرح نہیں چل سکتیں تو کم از کم ایگزاسٹ فین کی طرح میرے سانسوں کو۔ جو سانس باقی ہیں ان کو تو چوس کر حیاتی سے باہر نہ پھینکو۔ کہیں یہ تو نہیں کہ وہ اب بھی اسی چھوٹے سے کمرے میں قید ہے، اسی سفید دیوار کی طرف رخ کر کے چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ سفید دیوار جو اس کی دوست تھی۔ ایسی دوست جو خود تو خاموش ہے مگر تمہاری ساری گفتگو بُت بنی سنتی رہی۔ سفید بُت!

وہ کچھ کھائے پئے بغیر خاموشی سے گھر سے باہر نکل جاتا اور سائیکل پر سوار ہو کر سکول چلا جاتا۔ ہر ساتویں آٹھویں روز گاؤں سے چاچے کا خط آتا۔ بیٹا، مجھے بخار آتا ہے۔

تمہاری ماں کھانسی سے بد حال ہے۔
زمین چھڑانے کا کوئی بندوبست کرو۔

کوئی حیلہ کرو۔

کچھ تو کرو۔

کچھ پیسے ہی بھجودو۔

اپنی نیک کمائی بس سے

ذکوۃ ہی نکال بھجو۔

ہمارے پاس تو دو وقت کی روٹی کے لئے

بھی پیسے نہیں ہیں۔

نیک کمائی! وہ خط پڑھ کر ہمیشہ ایک ہڈیانی ہنسی ہنستا اور سر ہلاتے ہوئے ہنستا ہی رہتا۔

دیے تو سکول سے دو بجے ہی چھٹی مل جاتی مگر وہ شام سے پہلے گھر نہیں لوٹتا چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کی خاطر وہ ایک ایسے چور لبے میں جا کھڑا ہوتا جہاں سے گذر کر شہر کے سارے جنازے قبرستان کی طرف جاتے تھے۔ اب وہ جنازوں کا ایکسپٹ ہو چکا تھا۔ اگر چار بندے پھٹی پرانی چادر میں لپٹے کسی مرنے کو چارپائی پر یوں اٹھانے چلے جا رہے ہوں جیسے اس کی لاش کو سڑکوں پر گھسیٹ رہے ہیں تو وہ کوئی فقیر ہے جو رات کو سردی سے ٹھٹھکر کر مر گیا ہے۔۔۔۔۔ یا کوئی مزدور جس کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور اُسے اُس کی اپنی مشین نے پیس ڈالا ہے۔ ایک مرتبہ وہ یونہی بے دھیانی میں ایک ایسے ہی جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چارپائی اٹھانے والے اُسے گھور گھور کر دیکھتے رہے کہ یہ اکلوتا رشتہ دار کہاں سے آگیا ہے۔ قبرستان پہنچے پر جب وہ لاش کو ایک گڑھے میں پھینکنے لگے تو اُس نے آگے بڑھ کر کہا: ”میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں“

کارپوریشن کے خاکروہوں نے جو جلد از جلد اُس پر مٹی کی چند کدالیں ڈال کر گھر لوٹنا چاہتے تھے اُسے ناگواری سے دیکھا اور چادر ہٹا دی۔ چہرہ؟۔۔۔۔۔ پتہ نہیں وہ لاش کا چہرہ تھا یا جسم کا کوئی اور حصہ۔ صرف ماس کی دلدل تھی۔ جس میں آنکھیں اور ناک ہوا یہ کچر کی طرح تھے۔ شاید یہ اُس کا پیٹ تھا۔ ایک مزدور کا پیٹ۔ وہ نہ تو گورا تھا اور نہ سیاہ فام۔ اُس کے خون آلود چہرے (؟) سے یہ تعین بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کون سے ملک کا باسی ہے۔ افریقہ کا ہے، ایشیا کا ہے یا امریکہ کا ہے۔ بس ایک مزدور کا پیٹ تھا۔ ماس کی دلدل۔ کچھ جنازے پھولوں سے لدے ہوتے۔ موتے، گیندے اور گلاب کے عطر

www.pdfbooksfree.pk

کی خوشبو سے کاریں رک جاتیں سائیکل سوار کھڑے ہو جاتے اور چوک کے درمیان اپنے چہوتے پر کھڑا ٹریفک کا سپاہی نیچے اتر کر ٹریفک روک دیتا۔ ان جنازوں کے پیچھے خلقت کا ایک سیلاب ہوتا۔ کسی دھن والے کا جنازہ جو قوم اور ملک کے غم میں گھلتا گھلتا دل کی حرکت بند ہونے سے انتقال کر گیا۔ اس قسم کے جنازوں میں شامل افراد سر جھکا کر ایک ہی جگہ پر نہیں چلتے جاتے تھے بلکہ ساری مخلوق میں ترپتے پھرتے تھے۔ ”بڑا افسوس ہے۔۔۔۔۔ اللہ جنت نصیب کرے۔۔۔۔۔ میاں صاحب جیسے لوگ۔۔۔۔۔ ہمارے تو اُن داتا تھے۔۔۔۔۔ ہم تو اُن کے خادم تھے۔۔۔۔۔ اب آپ کے خادم ہیں۔۔۔۔۔ بڑا افسوس۔۔۔۔۔“ اپنی موجودگی ریکارڈ کروانے کے بعد وہ ہمیشہ ادھر اُدھر ہو جاتے۔ ان جنازوں میں قریبی رشتے داروں کے علاوہ بیشتر لوگ صرف حاضری لگوانے آتے تھے بلکہ رشتے دار بھی۔ وہ بچوں، بوڑھوں، ماؤں، باپوں، بھائیوں بیٹیوں، بیٹیوں کے جنازوں میں شامل لوگوں کے چہروں سے اندازہ لگا لیتا کہ یہ باپ ہوگا۔ کیونکہ اُس کے پاؤں گھسٹ رہے ہیں۔ یہ بھائی ہوگا۔ ننگے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ یہ بیٹا ہے، سیاہ عینک کے پیچھے آنسو گراتا۔ اور یہ حاضری لگوانے والا ہے جو بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ سوچتا کہ اگر کل کلاں میں مرجاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کون سے لوگ چلیں گے اور کتنی دور تک چلیں گے۔ بال کون نوپے گا۔ روئے گا کون کون۔ اور کون دوچار آنسو بہا کر سگرٹ سلکالے گا۔

کئی مرتبہ چوک میں سے کوئی تانگہ گذرتا۔ پچھلی نشست پر سڑوں پر رومال پیٹے دو تین آدمی میت اٹھانے والی چارپائی کے پائے مضبوطی سے پکڑے ہوتے وہ ذہنی طور پر اُس تلنگے کا پیچھا کرتا اور حساب لگانے لگتا کہ چارپائی موت والے گھر میں پہنچ گئی ہوگی۔ اس وقت میت کو غسل دیا جا رہا ہوگا۔ اب کفن کی

گانشیں باندھ رہے ہوں گے۔ بس آدھ پون گھنٹے میں جس موڑ سے تانگہ نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہاں سے کلمہ شہادت کی آواز سنائی دے گی۔ اگر اتنی دیر بعد جنازہ نمودار نہ ہوتا تو وہ سوچتا۔ ہاں بہنیں پاؤں نہیں چھوڑتی ہوں گی۔ کراچی سے بھائی نہیں پہنچ پایا ہوگا۔ قبر کے لئے مناسب جگہ کا انتظام نہیں ہوا ہوگا۔ یا شاید گھر میں رقم نہیں ہوگی۔ قبر کی قیمت ادا کرنے کے لئے۔

وہ شام دھلے گھر واپس آتا اور ایک میت کی طرح بے حس و حرکت چارپائی پر لیٹ جاتا۔ سامنے سفید دیوار اور۔۔۔ پیچھے گھروالی کا ٹیپ رکارڈر آن ہو جاتا۔ سن رہے ہو۔۔۔ آج دودھ والے نے جواب دے دیا ہے۔ چھوٹی بچی کی اُستانی نے ایک دوپٹے کی فرمائش کر دی ہے۔ اُسے پاس کرنے کی فیس۔ ہنڈیا کا کنارہ ٹوٹ گیا ہے۔ نئی پانچ روپے میں آتی ہے۔ سن رہے ہو۔۔۔

۹

”میری گردن کب ہو سے چھڑی جائے گی؟“
”اب زیادہ دیر نہیں“

بندے نے سامنے دیکھا۔
وہی اجاڑ اور خالی میدان۔ ایک سُندھ سفید دیوار کہاں گئی؟
کہیں وہ ایک واہمہ تو نہیں تھی؟
ہاں واہمہ ہی تھی۔
وہ دیوار تو اُس جہان میں ہے۔
اب کسی اور بندے کے سامنے۔
اُس جیسے کسی اور بندے کے سامنے۔
یا شاید۔
اُس جہان کے تمام بندوں کے سامنے۔

کیوں نہ چل دے؟ — میدان والا ٹنڈ منڈ درخت، بہت بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ تو چھاؤں دینے کا دعویٰ ہی نہیں کرتا۔

لوگوں نے کہا، وہ بزدل ہے، سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتا؟ — معاشرے کے بدبودار جو ہڑیں مزے سے کھڑا ہے — گھر والی کے سامنے اپنے جسم کو پتھر بنالے، پتھر کا دماغ اور پتھر کی شریانیں — دوستوں کے رتبے کی قدر کر کے اپنی اوقات میں ہے — یہ سب کچھ کرنا تو بہت آسان ہے، کیوں نہیں کرتا؟ فرار کیوں ہوتا ہے؟ — لیکن آپ ہی انصاف کیجئے کہ اگر وہ واقعی بزدل ہوتا تو خوفزدہ ہو کر سمجھوتا نہ کر لیتا؟ — زور آوروں کے احکام کی گھڑی پیٹھ پر اٹھائے حیاتی کے کھیت میں ایک پھر تیلے بیل کی طرح نہ بھاگتا؟ — بے شک گدھ اس کے جسم پر سوار ہو جاتے۔

اُس کے ماس میں چونچیں دلو کر اُس کا خون پیتے بہتے، اپنی گردنوں کو جی مکر مرنج کرتے — کیونکہ راج گدھوں کا تھا — لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اس اکلوتے انکار کے بعد اُس کے چاروں طرف چونچوں کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ یہ دیواریں اس کے قریب آنے لگیں۔ اور پھر چونچوں کی یہ کال کوٹھڑی اتنی تنگ ہو گئی کہ ماس لینا ہی مشکل ہو گیا۔ — اگر وہ کچھ دیر اور اسی جہان میں رہتا تو گدھوں نے اُس کی آنکھوں کے دھیلے نکال کھائے تھے، کانوں کے پردے چھید دینے تھے اور زبان کو جڑ سے اکھاڑ لینا تھا۔ — اُس نے اپنے اندر کے کاٹھ کبار کو پچ کے جھاڑو سے سمیٹا اور باہر پھینک دیا اور یوں اندر صرف انتظام کا ایک تنکا باقی رہ گیا — تب وہ اس میدان میں آکھڑا ہوا۔

اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا — تین طرف اُچار کے اُجرے ہوئے پکھرو خواہیدہ تھے اور چوتھی جانب اُس کا اکلوتا ساتھی ٹنڈ تنگ

۱۰

بندہ اگر اپنے ماحول میں مِس فٹ ہو جائے (ایسے معاشرے میں جہاں جونکوں اور گدھوں کی حکمرانی ہو وہاں تمام سوچنے سمجھنے والے مِس فٹ ہوتے ہیں) تو وہ دکھ ہو کر اپنے گھر جاتا ہے اور سب سے لاتعلقی ہو جاتا ہے اور اگر اپنا گھر کانٹوں بھرے لیکر کی طرح راستہ روک لے، سامنے سفید دیوار آجائے تو پھر بندہ دوستی کے گھنے درختوں کی چھاؤں تلے جا کھڑا ہوتا ہے۔ (ماس لینے کے لئے) اور اگر یہ چھاؤں بھی چھدری ہونے لگے (اس معاشرے کی کمینی کا میا بیاں دوستی کی خالص شراب میں پانی کی طرح گھسکتی ہیں اور اس کا نشہ ختم کر ڈالتی ہیں ہاں اگر دوستوں کے درمیان کامیابی اور دولت میں بھی برابری کی سطح قائم ہے تب دوستی قائم رہتی ہے ورنہ نہیں۔) تو دوستی کے گھنے درخت ٹنڈ بن جاتے ہیں — رُٹے ہوئے یاروں کو بھلا کون مناتا ہے؟ اگر درخت پر پتے نہ ہوں تو پھر چھاؤں کیسی اس کے بعد تم وہیں کھڑے رہو یا چمیل میدان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر سدا کے لئے دھوپ میں جلنا ہی مقصد رہے تو بندہ اُچار میدانوں کی جانب ہی

پننگا، پتوں اور ٹہنیوں کے لباس سے عاری — شام ہوئی تو اس میدان کی حیاتی
میں پہلی مرتبہ — پہلی مرتبہ بندے کی روح کی گردن کے ساتھ تنہائی کا تیندوا چمٹ
گیا — آج کی رات کیسے گزرے گی؟

سُورج مغرب ہوا تو اُس کے چار چھیرے کا میدان یوں پیلا پڑ گیا جیسے کسی
قر کے اوپر گیندے کے پھولوں کی چادر بھی ہوتی ہے۔ سردی کے برف ہاتھ عرشوں
سے اتر کر میدان میں جذب ہونے لگے۔ بندے کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے
لگے اور وہ یوں بے اختیار ہو کر ٹھٹھرنے لگا جیسے بری کا درخت بچوں کے ایک
مرتبہ ہی جھلانے سے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اُس کے اندر جو سائیں کا مچ روشن
تھا وہ بھی بے اختیار تھا اور اُس نے مدادی میں تہاڑے اندر کو تو گر مانی دے
سکتا ہوں لیکن باہر کے تم خود ذمہ دار ہو — اپنی کوشش کر دیکھو —

آج — پہلی مرتبہ

اُسے تنہائی کی زبانوں نے چاٹا۔

جسم کا اندر تنہائی کے کانٹے تیکھے ہو گئے۔

یہ خون چوسنے والی جونکوں کی

نامعلوم جلن نہیں تھی جو جسم کو چھلنی کرتی رہتی ہے۔

یہ تنہائی کا درد تھا۔

”مجھے ایک ساتھی درکار ہے۔

میں اجتماعی جانور ہوں۔

میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔

میں گفتگو کرنا جانتا ہوں

میرا جبر اتنی صدیوں سے مقفل ہے کہ
اب اُس میں کافی اگ آئی ہے

میری زبان نالو کے اوپر

ایک بوڑھے کچھوے کی طرح میٹھی میٹھی

اب اُگتا چکی ہے۔

یہ حرکت کرنا چاہتی ہے۔

اور میں نے... گفتگو کیا کرنی ہے؟

اس کے بائیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بس مجھے ایک ساتھی درکار ہے۔

کیونکہ کیشن میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔

سیاہ موت رات نے بائیں پھیلائی اور آج میدان، بندے اور ٹنڈ کو آغوش

میں سے کرتا رہی کے گہرے سمندر دل میں غوطہ مار گئی۔



اس کا ہاتھ اپنی پیٹھ کی جانب پٹکا....
 نہیں۔۔۔ میں انہیں اپنی پیٹھ کے اندر
 چونچیں نہیں گھسیٹنے دوں گا۔
 میں تو اُس جہان کو چھوڑ آیا ہوں
 جہاں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔
 میں اچھے جولاہے کا گدھا تو نہیں۔ ایک گدھا!
 گدھوں کی شوکتی ہوئی آواز نزدیک آنے لگی....
 اور نزدیک....

اس کے پاس کلتر زدہ زمین کے ایک ٹکڑے نے۔۔
 اپنے اوپر بھی دھوپ کو چوس لیا تھا۔
 تاریکی کا دروازہ کھول دیا تھا
 سایہ! موت، کا سایہ....
 گدھوں کے سیاہ بادل کا سایہ، اُس کے پاس کلتر زدہ زمین
 کے ایک ٹکڑے پر.... موت کا سایہ!
 بندے کے دل میں چھپے خوف کے سنیو لے نے۔
 اپنی دم ہلائی۔
 ”ہاں میرا وجود ہے.... میں خوف ہوں!“
 زمین کا وہ ٹکڑا جو روشنی سے الگ ہو کر
 اندھیرے کی جانب رواں تھا.... پھیلنے لگا،
 پھیلتا گیا۔
 گدھ نیچے ہوتے گئے۔

ایک بادل۔۔۔۔
 سیاہ رنگ کا۔۔۔ گرجتا ہوا بادل۔
 گدھوں کا ایک بادل،
 شمال کی جانب سے شوکتا ہوا آیا۔
 بے شمار پردوں کی شوکتی ہوئی آواز
 بگولے کے پہلے اور طویل سانس کی طرح
 آہستہ سے کانوں میں آئی۔
 اور پھر.... نزدیک ہونے لگی۔
 بندے نے اپنے اوپر الٹا دہ
 آسمان پر نگاہ ڈالی
 یہ تو صرف دو تھے.... ایک گدھا، گدھا!
 آج یہ ریور کا ریور کہاں سے نمودار ہو گیا۔

زمین پر اُن کا سایہ ، سیاہی ہوں پر گرتے
 روشنائی کے قطرے کی طرح پھیلتا گیا۔
 بگولے کے طویل سانس اب ،
 ساون کے بادلوں کی طرح گر جئے لگے۔
 لاکھوں بھن ولے ساہیوں کی شوق۔
 سایہ !

گدھوں کا سایہ ،
 پانی میں گرتے نیل کی طرح
 پھیلتا گیا۔

بندہ پھیلتے ہوئے سائے کو مہبوت ہو کر
 اس طرح دیکھ رہا تھا — جیسے
 کسی نے اُس پر ٹونا کر دیا ہو — جادو کر دیا ہو
 مہبوت اور بے اختیار ہو کر وہ دیکھتا رہا۔
 سائے کو ! سائے کو !
 مہلا وہ اپنے اوپر گر جتی موت کو دیکھنے کا
 حوصلہ کہاں سے لاتا ؟
 بس وہ گم سم ہو کر —
 پھیلتے ہوئے سائے کی طرف دیکھتا رہا۔ . . .

جو پڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح
 اُس کے پاؤں کے قریب پہنچ رہا تھا

سایہ جتنا نزدیک ہو رہا تھا . . . گدھوں اور اُس کے درمیان

فاصلہ . . . اُسی حساب سے کم ہو رہا تھا۔
 بالآخر سایہ اس کے پاؤں تک آگیا۔
 بوٹوں پر پڑا۔
 گھٹنوں تک آیا۔ . . .

کولہوں تک پہنچا۔

سینے پر پڑھ بیٹھا۔

کندھوں پر سوار ہو گیا

اور پھر . . . اس کے سائے وجود پر

پر چھائیں پھیل گئی . . . سایہ ہو گیا۔

سائے کا سیلاب اُسے ڈبو چکا تھا۔

اُس کی آنکھیں ایک پتلی کی طرح اچانک کھلیں

کھلیں اور بند ہو گئیں اور پھر کھل گئیں۔ "جاگو"

اگر تم مزید ایک پل کے لئے بھی یوں

ساکت کھڑے رہے تو

تمہارے جسم پر گدھوں کا سایہ نہیں

اُن کی چونچیں ہوں گی . . . "جاگو"

اُس نے دل کڑا کر کے آسمان کی طرف دیکھا

(آسمان تو دکھائی نہ دیا کہ درمیان میں

گدھوں کی پرواز کرتی ہوئی دیوار تھی)

اس کی نظروں کے سامنے . . .

پرویا جاتا۔
 ساری چونچوں پر خون کی سُرخ تھی
 لیکن گدھ
 صرف چونچ رنگ لینے پر اکتفا نہیں کرتے
 چونچ کے پیچھے گردن بھی تو ہوتی ہے — اور جب تک
 گردن نہ رنگی جائے — لطف نہیں آتا۔
 ”کبھی تم نے بند کھایا ہے؟“
 ”کوئی ایک مرتبہ“
 ”گیند کی طرف دھیان کر — بند کھانے کا وقت ابھی نہیں آیا“
 شاید حیات کا یہی کھیل ہے (بندے نے سوچا)
 لیکن یہ کھیل نہیں ہو سکتا
 اُن گنت چونچوں اور ایک گیند کے درمیان
 کھیل کبھی نہیں ہو سکتا
 ہاں، حیات و موت کی کشمکش ضرور ہو سکتی ہے۔
 پروں کا گیند
 چونچوں کے گھرے میں
 یوں مسلّا گیا جیسے
 کھرو را ہاتھ
 کوئل چھاتیوں کو
 مسل دیتا ہے۔
 پروں کا گیند

بے انت گدھوں کے پر پھیل گئے
 پتہ نہیں وہ بے انت تھے یا
 صرف ایک ہی گدھ تھا جس کے پر
 آدھے آسمان پر محیط تھے۔
 نہیں صرف ایک گدھ نہیں تھا۔
 بے انت تھے۔
 پروں سے بنی ہوئی ایک دیوار تھی۔
 دیوار نہیں چار دیواری تھی۔
 اور لمبی گردنوں کا احاطہ تھا۔
 اور اس چار دیواری اور اس احاطے کے درمیان میں
 درمیان میں
 ایک ننھا سا گیند لڑھک رہا تھا۔
 پنگ پانگ کے سفید گیند جتنا
 جیسے تاریک سمندروں پر ایک سفید بگلا۔
 اُس کے سفید جسم پر
 خون کے سُرخ چھینٹے۔
 ایک چونچ اُس کے کوئل جسم میں کھتی
 اور وہ برچھی میں پروئے کسی بندے کی طرح
 تڑپ کر اپنے آپ کو علیحدہ کرتا
 رُخ بدل کر دوسری جانب پرواز کرنے لگتا تو
 چونچ کی ایک اور برچھی منتظر ہوتی، اُس میں

چار چھیرے ایستادہ، موت کی دیوار سے
سر ٹکراتا ہے باہر نکلنے کا چار اکر تا ہے۔
مگر ہر بار ایک اور چوٹ گیلی ہو جاتی ہے مٹرخ ہو جاتی ہے۔
آخری گھڑی نزدیک آپہنچی
سیاہ بادل بندے کے سر پر گرجنے لگا۔
پروں کا گیند ادھ مو ا ہو گیا

مزید ایک چوٹ اور
اُس کی اڑان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔
”مجھے ایک ساتھی درکار ہے“

بندے نے گردن اٹھائی
لاکھوں برس پہلے کی گمشدہ وحشی قوت کو
صدادی۔

اس قوت کو اپنے ٹخنوں میں سے کھینچ کر
سینے تک لے آیا۔

اس قہر کو دل میں جلتے الاؤ میں سے گزار کر
آنکھوں میں اُنڈیلا۔

اور پھر

جلتی ہوئی یہ دوا نکھیں گدھوں کی دیوار پر
رکھ دیں۔

جیسے تھیں میں دو چنگاریاں گریں
ایسے موت کی دیوار میں دو سوراخ ہو گئے۔

دو زخم کھل گئے۔
پروں کے گیند نے گھپ اندھیرے میں دو لکیریں
چمکتی ہوئی دیکھیں

لکیروں میں سے روشنی، پنہوں کے بل چلتے چور کی مانند
دھیرے دھیرے اندر آرہی تھی (حیات کا سندلیہ)
وہ ایک ہی اڑان میں روشنی کے ان سوراخوں میں سے
گذرا اور

باہر آ گیا۔

ایک گہرا سانس۔

آزادی کا سانس۔

روشنی کا سانس۔

بندے نے اپنا ہاتھ اُونچا کیا اور ہتھیلی کھول دی،

پروں کا گیند نیچے آیا،

پروا کے ایک جھونکے کی طرح۔

چپ چاپ، ہتھیلی پر بیٹھ گیا،

وہ ایک تنکے سے بھی ہلکا تھا

یہ پکھرو تھا۔

بندے کی آنکھوں میں سے اُبلتے قہر کی تیش نے گدھوں کے جسم اس طرح

جدا کئے کہ اُن کا سیاہ بادل بے اختیار ہو کر آسمانوں کو پرواز کر گیا۔ بے اختیار جیسے

کسی بگولے کی زد میں آ گیا ہو۔

بندے کی ہتھیلی کو پکھرو کے نرم نرم پنجے ایسے محسوس ہوئے جیسے باپ

کی چوڑی چھاتی پر سویا بچہ اپنی انگلیاں اُس کے سخت جسم پر پھیلا دیتا ہے۔
 ”کیوں بستی کیا اچھے جولا ہے کے گدھے اُس جہان میں ختم ہو گئے ہیں
 جواب تم ایسے مسکینوں کے درپے ہو گئے ہیں؟“

بندے کی ہتھیلی پر پکیرو کے پنجوں کا بکا سا بوجھ محسوس ہوا اور وہ اڑا....
 اور ٹنڈ پر جا بیٹھا.... ٹنڈ کی سوکھی ہڈیوں پر اُس کے گیلے خون کے چند قطرے گرے۔
 اُس کے تمام پر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے.... بکھرے ہوئے تھے.... ایک پر
 اُس کے زول جُستے سے الگ ہوا اور جھولتا ہوا زمین پر اترنے لگا.... بندے نے
 اپنا ہاتھ آگے بڑھایا.... زمین پر گرنے سے پیشتر ہی اُسے پکڑا اور اپنے کوٹ
 کے کنارے میں سجایا....

یوں اکلا پے کے شیشے میں دراڑ آئی۔
 بندے اور پکیرو کی سانجھ کی بنیاد رکھی گئی۔



”نیچے دیکھ“
 ”کچھ بھی نہیں.... وہی اجاڑ میدان، وہی بند اور وہی ٹنڈ....
 لیکن اب ٹنڈ کے اوپر وہی پکیرو بیٹھا ہوا ہے؟“
 ”وہی پکیرو؟.... ایک نوا بھی نہیں ہوگا.... تم بندے کی طرف دھیان
 کرو“

بھرجاتی.... اور پکھرو وہ دیکھنے کا چارہ کرتا.... مگر وہ تو بول ہی نہیں سکتا تھا۔
یوں بے حساب دن اور رات بیت گئے۔

آہستہ آہستہ پکھرو کے بھرے ہوئے پر جڑنے لگے.... ٹوٹے ہوئے
پروں کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹیں.... اُس کے زخم بھرنے لگے.... چھدی ہوئی
زبان پر نیا ماس اُگنے لگا.... ٹنڈ پر گرے ہوئے خون کے قطرے خشک ہوتے
گئے.... پہلے تانبے کے رنگ کے ہوئے پھر سیاہ اور بالآخر دھوپوں نے انہیں
چاٹ لیا.... ایک صبح آئی.... اور پکھرو نے اپنی چوچ کھولی۔
پکھرو : میں پکھرو ہوں۔

بندا : میں بندہ ہوں۔

پکھرو : تم اس اُجاڑ میدان میں کیا کرنے آئے ہو؟

بندا : پہلے تم بتاؤ.... تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

پکھرو : تم نے دیکھا تو تھا.... گدھوں نے میرا محاصرہ کر کے مجھے یہاں لا پھینکا تھا۔

بندا : مجھے بھی گدھوں نے.... (اس پکھرو کو میں دیکھ چکا ہوں.... لیکن

کہاں؟ کب؟.... اس جہان میں.... میں اسے جانتا ہوں، اسے

نہیں تو اس کی پروں کی شوکر کو جانتا ہوں.... پر کیسے؟.... کہاں؟)



اُجاڑ میدان.... ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں.... وجود کے
اندہ.... اندر کے اندر.... آسمانوں سے باتیں کرتی ایک ایسی پتنگ جس
کی ڈور کا سرا نا معلوم.... اور اس میدان میں نہ بندہ نہ پرندہ.... نہیں بندہ
بھی اور پرندہ بھی — اور ٹنڈ بھی۔

نہ تو بندے نے زبان ہلائی اور نہ ہی پکھرو نے چوچ کھولی.... بندہ اس لئے
خاموش رہا کہ وہ ابھی اپنی حیاتی کے پہلے ساتھی کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا....
جس روز وہ اس میدان میں آیا اُسی روز تو اس کی اصلی حیاتی کا آغاز ہوا تھا.... وہ
یہاں بالکل پاک ہو کر آیا تھا.... پیدا ہونے کے بعد پہلے سانس کی طرح وہ اُس
کی آنکھوں کے سامنے آنے والا پہلا ذی رُوح تھا.... اور پکھرو؟.... اُس
میں تو سکت، ہی نہیں تھی بولنے کی.... اُس کا جسم تو ایک روٹی دار گدے کی طرح
سلا ہوا تھا.... چوچوں کی سوتیوں سے.... اُس کے پر بھرے ہوئے تھے اور
زبان چھد چکی تھی.... بندہ، پکھرو کی جانب دیکھتا اور مسترست اُس کے جسم میں

کہیں پھلی جانی میں ایک بنگلہ تھا.... لان کی خشک گھاس کے درمیان ایک درخت.... سبز پتوں اور زندہ ٹہنیوں والا درخت.... یہ بنگلا ایک ایسے دوست کا تھا جسے ابھی اپنے اور بندے کے درمیان دھن کی کھائی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ دولت کا زہرا بھی سطح پر تھا، آنتوں اور گوں میں نہیں اُترا تھا.... وہاں اُس بنگلے میں دوستوں کی بیٹھک ہوتی، انگوروں کا تیز رس زبانون، مسوڑھوں کو سینکتا جب جسموں میں اُترتا تو ایک عارضی علیحدگی، گدھوں سے، جونکوں سے، سفید دیواروں سے وجود میں آتی اور جب سب لوگ باہر سے کٹ کر اپنے اندر میں جھانکنے لگتے تو وہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر لان میں آجاتا.... لان میں سبز پتوں اور زندہ ٹہنیوں والا درخت تھا.... بندے کے پیالے ہاتھ اُس کے تنے کو آغوش میں لیتے اور وہ اس کے ساتھ کان لگا کر اُس کے سبز سانس سننے لگتا.... یہ درخت بھی زندہ ہے، میری طرح.... لیکن میں پتوں اور ٹہنیوں کے بغیر کیوں ہوں؟ پہلے پہل تو وہ درخت کے ساتھ اس لئے لپٹا کہ اُسے اُس میں سے محبت کی ہبک

اور زندگی کی باس آتی تھی (کیونکہ وہ ان خوشبوؤں کے لئے ترستا تھا) اور پھر ایک شب جب چاندنی کا سفید غبار کل کائنات پر معلق تھا جیسے رونی دھنکنے والے کی کوٹھری سفید دودھ ہو رہی ہوتی ہے، اُس نے درخت کو اتنی شدت کے ساتھ گلے لگایا (اس روز وہ گدھوں اور سفید دیوار سے کچھ زیادہ ہی اکتا گیا تھا) اتنی قوت سے جھنجھوڑا (جیسے بیروں سے لدی بیری کو جھنجھوڑتے ہیں.... جو بن اک بیری) کہ پہلے تو اُس پر خزاں رسیدہ پتے سُرخ برف کی مانند گرنے لگے، پھر کوسے کاغذ کی ایک کھڑکھڑاہٹ.... درخت کے پتوں میں خوابیدہ ایک پکھیر اُٹ گیا.... درخت کی زندگی جیسے نچڑ گئی ہو.... دوسری شب وہ پھر درخت کے پاس جا کھڑا ہوا.... اس پکھیر کو کیا حق ہے کہ وہ یوں سکھ چین سے سوتا ہے (اگر مجھے یہ حق حاصل نہیں) اُس نے تنے کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور پکھیر پر پھیلاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا.... اب وہ ہر شب اسی طرح کرتا.... اور پھر ایک شب ایسی آئی کہ اُس نے درخت کو جھنجھوڑا مگر کچھ بھی نہ ہوا.... نہ پتے گرے.... اور نہ ہی پیروں کی سرسراہٹ کانوں میں اُتری.... پکھیر وہ درخت چھوٹ چکا تھا....

پکھیر و : (دل ہی دل میں) وہ پکھیر میں تھا۔
 بندہ : (دل ہی دل میں) ہاں مجھے معلوم ہے۔



(۱۶)

گدھوں کی پرچھائیں بندے کے اوپر بھی اور آنکھ جھپکتے میں دور ہو گئی۔
اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا.... دو گدھ.... مگر اتنی بلندی پر کہ اُن کے
ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا....

پکھیرو : کیا دیکھ رہے ہو؟

بندا : گدھ....

پکھیرو : ابھی دُور ہیں.... لیکن بالآخر یہ نزدیک ہوں گے۔۔۔۔۔ تم اُن کے
آنے سے پیشتر میرے ساتھ جی بھر کے باتیں کر لو۔

بندا : (دل ہی دل میں) یہی تو میں چاہتا ہوں۔

پکھیرو : تم مجھے یہ بتاؤ.... اس اُچار میدان میں کیا ڈھونڈنے آئے ہو؟ کیا چاہتے

ہو؟.... نہیں کس کی تلاش ہے؟.... اُس جہان میں کامیابی کا نسخہ

تلاش کرنے کے لئے یہاں آگئے ہو.... یا اتنے ڈرپوک ہو کہ وہاں کی

کھٹنا بیوں سے دامن چھڑا کر یہاں بھاگ آئے ہو؟

(۱۵)

”اب تو وہ دو ہو گئے ہیں.... وقت کب آئے گا؟.... کب؟“
”حوصلہ رکھو.... جتنا انتظار کرو گے اتنا ہی تمہاری گردن پر خون کا لپ پ
گاڑھا ہوگا.... ابھی وقت نہیں آیا۔“

بندا : (دیہ پکھرو.... اس دیر لانے میں میرا پہلا ساتھی، یہ بھی مجھے فراریت پسندی کا الزام دیتا ہے.... شاید اس لئے کہ میں نے اسے درخت میں سے اڑا دیا تھا) کامیابی کا نسخہ حاصل کرنا تو چنداں دشوار نہیں.... خون کو سفید کر لو، بس یہی نسخہ ہے.... اور میں ڈپلوک بھی نہیں، میں نے پوسے چالیس برس اس جہان میں گزارے ہیں۔

پکھرو : تو پھر یہاں کیسے آگئے؟.... کیسے پہنچ گئے؟

بندا : بس یوں سمجھ لو کہ ایک شام میں گھرواپس آیا (پندرہ جتانے دیکھنے کے بعد) ہمیشہ کی طرح گھروالی کے ماتھے پر شکنوں کا ایک جال بنا ہوا تھا (کچھ میرا بھی خیال کرو.... کوئی تو خیال کرے.... میں سانس لیتا ہوں.... اگر سانس لیتا ہوں.... اگر سانس لیتا ہوں تو زندہ بھی ہوں اور زندہ بندے کو پیار کی ضرورت ہوتی ہے.... مجھے دھتکارو نہیں) مگر اس مجاگوان کے چہرے پر میرے لئے سدا کی بیزاری اور ناپسندیدگی کی شکنوں کا سیلاب آیا ہوا تھا.... کب تک؟.... کب تک؟ گدھوں کی چونچیں مجھے دھکیلے ہوئے گھر پہنچا دیتی تھیں مگر وہاں بھی.... ایک اور گدھ.... میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی سفید دیوار کو دیکھنے لگا.... سفید دیوار جو میری سدا کی سجت تھی۔ میری گھروالی کی آواز اس شام اتنی تیز اور نوکیلی تھی کہ میرے کانوں کے پردوں میں چھید ہو گئے.... اُن سے خون کی ندیاں بہہ نکلیں.... آنکھیں سوج کر سُرخ بیروں کی طرح ہو گئیں.... میرا دماغ غبارے کی طرح پھولنے لگا.... میں سفید دیوار کو دیکھتا رہا.... دیکھتا رہا.... اور پھر یوں ہوا کہ گھروالی کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی.... پیچھے رہ گئی....

کل جہان پیچھے رہ گیا.... میں سفید دیوار کی طرف دیکھتا رہا اور ہر شے سے الگ ہو گیا.... سب کچھ پیچھے رہ گیا.... اُس جہان کا سمندری جہاز ڈوب گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی.... خاموشی.... دیرانی.... اکلاپا.... میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں یا مجھے بھگا دیا گیا ہے.... مجھے کچھ پتہ نہیں.... بس ایک پل تو میں چارپائی پر لیٹا سفید دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اور دوسرے پل.... میں یہاں تھا.... اس اجاڑ میدان میں تنہا سفید دیوار اور اجاڑ میدان کے درمیان سفر میری موٹوں سے باہر ہے.... مگر یہ بتاؤ کہ میں تو یہاں آکھڑا ہوا ہے یا مجھے یہاں دھکیل دیا گیا.... تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

پکھرو : تم نے سب کچھ دیکھا، پھر بھی پوچھتے ہو؟ گدھ میرے ویری تھے.... بندا : لیکن گدھ سبھی کے ویری تو نہیں ہوتے.... اس جہان میں (یا شاید اُس جہان میں) لاکھوں پکھرو ہوں گے جن کے وہ ویری نہیں ہیں.... وہ تمہارے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے!

پکھرو : (ہنس کر) میرے پیچھے وہ اس لئے پڑ گئے کہ میں اپنی دُار سے الگ ہوں....

بندا : (میں بھی الگ ہوں) لیکن تمہیں کس نے الگ کیا؟

پکھرو : میں نے.... اپنے آپ کو.... خود الگ کیا۔

بندا : لیکن کس طرح؟

پکھرو : ایک مرتبہ اس جہان کے کل پکھروؤں کا اجتماع ہوا.... وہ بھی آئے جن کے نام تھے اور وہ بھی پہنچے جن کا کوئی نام نہ تھا.... (فرید الدین عطار کی کتاب ”منطق الطائر“ میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن کسی اور

وہ قاف کی پہاڑی تو نہیں....

پکھیرو : لیکن سی مرغ تک پہنچنے کے لئے راستے دشوار تھے اور ہم میں سے کسی

کو بھی مرنے کا شوق نہیں تھا.... سب پکھیرو بہانے بنانے لگے۔ کسی

نے کہا: ”مجھے سچ کی کیا ضرورت ہے؟“ مجھے اچھا کھلنے کو ملتا

ہے، اچھا پہننے کو ملتا ہے.... میں نے سچ کو کرنا کیا ہے؟“ کسی نے

خوفزدہ ہو کر پوچھا: ”اُن راستوں پر موت ہمارے منتظر ہوئی تو؟“ ایک

نے سوال کیا: ”اگر عہدِ قدیم سے ہمارے بزرگ سچ کے بغیر رہتے آئے

آئے ہیں تو آخر ہمیں آج اس کی ضرورت کیوں ہے؟“ تمام پکھیروؤں نے

اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سوال کئے لیکن ہر ہدف نے ان تمام سوالوں

کے ایسے ٹھوس جواب دیئے کہ سب خاموش ہو گئے اور اُس کے ساتھ

سفر پر روانہ ہو گئے.... میں بھی اُن کے ساتھ پرواز کرنے لگا۔

بندا : (دل ہی دل میں) بندوں سے پکھیرو بہتر ہیں جو کم از کم سچ کو تلاش کرنے

کی جستجو کرتے ہیں۔

پکھیرو : سی مرغ کو تلاش کرنے کے لئے ہمارا سفر شروع ہو گیا.... ہم تلاش

پیارے۔ یقین۔ آزادی۔ وصال۔ حیرانی اور غربت، موت اور نہ ہونے

کی سات وادیوں میں سے گزرے۔ اس سفر کے دوران کئی پکھیرو

سمندروں میں ڈوب گئے۔ کچھ ایسے تھے جن کی زبانیں سوکھ گئیں اور

وہ برف کی وادیوں میں پیاسے مر گئے۔ کٹیوں کے جگر سورج کی تپش

سے راکھ ہوئے اور اُن کے پر جھڑ گئے۔ کچھ جنگلوں اور صحراؤں میں

گم ہو گئے۔ کئی اپنے حواس کھو بیٹھے اور پاگل پن میں ایک دوسرے

کو کھا گئے اور کچھ نے ایسی انہونی شکلیں دیکھ لیں کہ وہ حیرت سے ہی

رنگ میں) وہاں ہر ہدف آیا جسے فخر تھا کہ اُس نے رب کے سچے نبی سلمان

کو ملک حبشہ کا راستہ دکھایا تھا.... گلہری بھی آئی جو اس بات پر نازاں

تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کی قربت میں رہی ہے.... طوطا بھی پہنچ گیا

.... ”میں خضر کی طرح سبز پوش ہوں“ اُس نے سینہ پھلا کر اعلان

کیا.... ببل اپنے آپ کو عُن داؤد کی وارث کہتی تھی.... فاختہ کو بھی

فخر تھا کہ طوفانِ نوح کے بعد اُس کی چونچ میں شاخِ زیتون دیکھ کر ہی

نوح کو انداز ہوا تھا کہ پانیوں کے درمیان کہیں خشکی کا ایک ٹکڑا ابھر رہا

ہے.... بور نے اپنے پروں کا رنگین پنکھا کھولا کیونکہ وہ اپنے آپ کو

پکھیروؤں کا جبریل کہتا تھا....

بندا : اور تمہیں.... تمہیں اپنی کس خصوصیت پر فخر تھا؟

پکھیرو : بس یہی تو فرق تھا مجھ میں اور اُن میں.... میری کوئی خصوصیت نہ

تھی، مجھے کسی بات پر فخر نہ تھا.... میں صرف ایک پکھیرو تھا۔

بندا : (دل ہی دل میں) یہی تو قابلِ فخر بات ہے پگلے.... مجھے بھی صرف

ایک بندہ ہونے پر فخر ہے۔

پکھیرو : ہر ہدف کہنے لگا: ”کل جہان کے جانوروں کے اپنے اپنے سردار ہوتے

ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں.... لیکن ہمارا کوئی سردار نہیں، آؤ ہم سب

اُس کا کھوج لگائیں....“ سچ کو تلاش کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ سچ

(ہمارا سردار ہمارا بڑا) ”قاف“ کے پہاڑوں کے پیچھے رہتا ہے

.... اور اُس سچ کا نام سی مرغ ہے۔

بندا : (دل ہی دل میں) میرے ایک دوست نے تہران کی پہاڑی دماوند

دیکھی تھی جہاں ایک روایت کے مطابق سی مرغ کا بسیرا ہے.... لیکن

پکھرو: تو نے تو اس جہان کے اندر رہ کر اس کا نظارہ کیا ہے لیکن میں نے تو اس سے الگ ہو کر.... درمیان میں مسافتوں کی طوالت ڈال کر نیچے جھانکا ہے۔ میں نے جب بھی آسمانوں سے نیچے جہان پر نگاہ کی تو مجھے مخلوق سے پُر شہر اس طرح دکھائی دیتے جیسے چٹیل میدان ہوں.... صحرا ہوں.... ہر طرف بربادی دکھائی دی اور ان بربادیوں میں آباد لوگ ریت میں سر چھپائے دکھائی دیئے.... تم بھی تو ان کے بھائی بند ہو.... تم نے بھی حیات اسی طریقے سے گزاری؟ ریت میں سر چھپائے؟

بندا: نہیں.... اگر میں یہ کر لیتا تو الگ کیسے ہو جاتا.... میں نے ایسا نہیں کیا.... لیکن تم نے بات بہت کام کی پوچھی ہے.... تم نے سچ کہا ہے، میں بھی تنہا صرف اس لئے رہ گیا کہ میں نے اپنی گردن ریت سے باہر رکھی تھی، میں چاروں طرف بکسری ہوئی بربادیوں کا چشم دید گواہ

مر گئے.... اور بالآخر سینکڑوں برسوں کی مسافت کے بعد جب ہم "قاف" کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو لاکھوں پکھروں میں سے صرف تیس باقی بچے تھے.... ہمارے سامنے ایک پردہ تھا.... ہڈ کہنے لگا، اس پردے کے پیچھے سی مرغ ہے.... سچ ہے.... پردہ اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے.... شائد ایک آئینہ تھا.... کیونکہ سامنے ہماری شکل کے.... بالکل ہماری شبابہت کے.... تیس پکھرو تھے.... جیسے ہماری تصویر بنا کر ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہو.... آئینے میں ہم خود تھے.... ہماری اپنی پرچھائیں تھیں.... کیونکہ ہم خود سچ ہیں.... سب کچھ ہم آپ ہیں.... ہم سی مرغ تھے۔

بندا: سب کچھ ہم آپ ہیں؟.... یعنی میں بھی خود ہی سب کچھ ہوں؟.... لیکن تم ان سب سے الگ کیسے ہو گئے؟

پکھرو: سب پکھروں نے سوال کئے.... اپنے آپ سے۔

بندا: تم نے کونسا سوال کیا؟

پکھرو: میں نے پیٹ کی بات کی.... میں نے پوچھا (اپنے آپ سے کیونکہ میں خود سچ تھا) سچ کی تجارت اگر بوجھ بھی لی جائے، سی مرغ کی پہچان ہو بھی جائے تو بھی ایک بنیادی سوال کا فیصلہ نہیں ہو پاتا.... سچ کے ساتھ ساتھ دانے پانی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔

بندا: پھر؟

پکھرو: پھر میں نکالا گیا۔

بندا: (میری طرح) ڈار سے الگ ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

تھا.... لیکن میرے آس پاس (یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا تھا یا ایسا تھا۔) بندوں کی گردنیں ریت میں تھیں شتر مرغ کی طرح.... اُن کے جسموں میں سے لہو ٹپکتا تھا، وہ کھا کھا کے اُپھر گئے تھے.... میں تنہا اُن کے درمیان کھڑا تھا۔ گردن اٹھائے.... دہائی دیتا ہوا کہ یوں ریت میں گردنیں دفن کر کے.... اپنی آنکھوں کانوں اور زبانوں پر ریت کی چادر پیٹ کر زندگی بسر نہ کرو.... کچھ دیکھو.... کچھ سنو.... کچھ بولو.... تنہا ہے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اُس میں سے اپنا حصہ وصول کرو.... یوں ریت میں منہ چھپا کے آسائش کی گرمی میں نہ اونگھو.... سرد موسموں کا مزا بھی چکھو.... جن پر ظلم ہو رہا ہے اُن کی فریاد سنو.... جو بھیتے جا گئے ہی مرتے جاتے ہیں اُن کو دیکھو!.... اور پھر زبان کو حرکت دے کر احتجاج کرو.... کچھ تو بولو۔

پکھیرو : تمہیں کوئی جواب ملا ؟

بندا : (ہنس کر) ہاں ملا.... انہوں نے آسائش کی گرمی کے کنوؤں میں سے گردنیں باہر نہ نکالیں اور وہیں سے بولے.... دور ہو جاؤ.... دفع ہو جاؤ.... دفع دور.... تم دیکھتے نہیں کہ ہم کتنے مزے میں ہیں۔ آس پاس دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں.... کوئی ضرورت نہیں.... اپنی اپنی گردنوں کو آسائش کی گرمی میں رکھنا ہی حیات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

پکھیرو : پھر تم تنہا ہو گئے ؟

بندا : ہاں.... پھر میں تنہا ہو گیا۔

(۱۸)

بندا : یہ بتاؤ.... دنیا جہان کے تمام دیس تمہارے پردوں کے نیچے سے گزے ہوئے ہیں.... وہ دیس بھی ہمارے دیس کی طرح ہی ہیں ؟
پکھیرو : میں تمام دیسوں میں تو نہیں گیا.... اپنا گھر بار چھوڑ کر میں صرف اُن دیسوں کو گیا جہاں میرے بدن کو حدت ملتی تھی.... مجھے کھانے کو ملتا تھا.... جہاں میرا پیٹ خالی نہیں رہتا تھا۔

بندا : وہ کونسے مقام ہیں.... مجھے بھی تو بتاؤ ؟

پکھیرو : اُدھر جہاں بندے کو بندہ سمجھتے ہیں.... جہاں سب برابر ہیں۔

بندا : سنا ہے وہاں رب رسول کا نام کوئی نہیں لیتا ؟

پکھیرو : وہاں بندے کا نام لیتے ہیں۔

بندا : (اپنے آپ سے) وہاں میرا نام لیتے ہیں۔

پکھیرو : (اپنے آپ سے) ہاں وہاں تمہارا نام لیتے ہیں۔

بندا : (اپنے آپ سے) یہ پکھیرو کتنا خوش قسمت ہے جو وہاں سے ہو کے آیا ہے۔

پکھیرو : کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو!
 بند : میں خاموش نہیں ہوں۔ صرف تمہیں میری آواز سنائی نہیں دی۔
 پکھیرو : وہاں بندے کا نام لیتے ہیں.... وہاں پکھیرو کا نام لیتے ہیں۔
 بند : اگر وہ دیں اتنے اچھے ہیں تو تم ہمیشہ اپنی دھرتی کی جانب ہی کیوں لوٹ کر آ جاتے ہو؟

پکھیرو : میں کھینچا چلا آتا ہوں بے اختیار ہو کر۔

بند : بھوک تمہیں ادھر کھینچتی ہے؟

پکھیرو : نہیں یہ دھرتی مجھے کھینچتی ہے.... اُن دیسوں میں جاتا ہوں تو وہاں کے پکھیرو مجھے بہت خوبصورت اور رنگین دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کسی رنگ ساز نے انہیں رنگوں سے لبریز کنستریں ڈلو کر نکالا ہو.... اور میرا رنگ؟
 ویسا ہی جیسی میری دھرتی ہے.... مٹی کا رنگ.... اُن دیسوں کے پکھیرو مجھے بد صورت کہتے ہیں.... میں واپس آتا ہوں اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوتا ہوں تو یہاں بھی پکھیرو میرے جیسے ہوتے ہیں.... اس لئے میں واپس آ جاتا ہوں.... میں اُن دیسوں میں نہیں رہ سکتا جن کی زمین کا رنگ میرے پروں سے مختلف ہو چاہے وہ میرے دیس سے لاکھ بہتر ہوں۔ وہاں پیٹ بھر کھانے کو بھی ملتا ہو.... میں وہاں ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتا.... یہاں سب پکھیرو میرے جیسے ہیں۔

بند : سب پکھیرو؟

پکھیرو : سبھی تو نہیں.... کچھ بہت دھن والے ہیں (جن کے کلمے بھی سیاے

ہوتے ہیں) رنگ تو اُن کا بھی میرے جیسا ہے۔ اُن کے پروں کی جڑیں بھی اسی دھرتی کے رنگ کی ہیں لیکن انہوں نے بیرونی ملکوں سے

مختلف رنگ درآمد کر کے اپنے آپ کو اُن میں رنگ لیا ہے.... سُرخ سبز، زرد.... لیکن اندر سے سب مٹیالے ہیں۔
 بند : بندوں نے بھی یہی کسب کیا ہے۔
 پکھیرو : (دل میں) مجھے معلوم ہے۔
 بند : (دل میں) مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہیں معلوم ہے۔

اور یوں بند اور پکھیرو ایک دوسرے کو اپنی آپ بیتی سناتے رہے۔ اُن کے آس پاس رُتوں کے میلے لگتے رہے.... وہ پوہ ماگھ کی بریلی رُتوں میں ٹھٹھرتے، جیٹھ ہاڑ کی کڑکتی دھوپوں تلے جلتے، ساون بھادوں کی برساتوں میں بھیگتے ایک دوسرے کی تنہائی کی دیواروں کو سمسار کرتے رہے.... پچھلی حیاتی کے کنویں میں سے پانی کے ڈول نکال نکال کر ہموار اور پیاسے میدان پر ڈالتے رہے اور تب انہیں گیان ہوا کہ اُن دونوں کی سانجھ اس میدان میں شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ تو پچھلے زمانوں سے چلی آ رہی تھی.... وہ ہمیشہ سے ساتھی تھے.... اُن کی ہڈیوں پر وار کرنے والی چونچیں ایک تھیں اور اسی لئے اُن کی ہڈی بتی ایک تھی.... یہی تو اُلجاؤ تھا.... کہ ان میں بند کو نسا ہے اور پکھیرو کون ہے؟ پکھیرو کون ہے اور بند کو نسا ہے؟

لیکن اس اُلجاؤ سے کیا فرق پڑتا تھا؟.... وہ باتیں کرتے رہے۔



کی تلاش میں شامل نہیں ہوئے تھے)
میں نے بے شمار زندگیاں اُن کے ساتھ اُن میں گزار دیں
لیکن میں الگ ہی رہا (میرے اندر ایک بے چینی تھی)
وہ صرف پکھرو تھے

میں بھی پکھرو تھا (لیکن نہیں بھی تھا)
میں نے ہمیشہ آسمانوں کو دھیان میں رکھا
اُنہیں کیس

آہستہ آہستہ اتنا اونچا اُڑا
اتنا اونچا مجھ سے پہلے کوئی پکھرو نہیں اُڑا تھا۔
(میں نے مشق کر لی تھی)
ہوا کا رخ، پروں کا زاویہ، سانس سنبھالے رکھنا۔
کسی پکھرو نے آج تک ان باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔
میں نے دھیان دیا، دھیان کیا۔
میں اپنے دماغ کو کام میں لایا اور اُس نئے کے آگے
اپنے کوئل بدن کے ساتھ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا
جسے قدرت کہتے ہیں (میں مقابلے پر آ گیا)
ایک روز

میں زمین پر واپس آیا تو دوسرے پکھروؤں سے کہا
”مچلیاں نکل کر سمندری گھاس سے پیٹ بھر کے ... بیٹ کر دینا
پھر پیٹ بھرنا، بیٹ کر دینا حیاتی نہیں ہو سکتی
سمندر پر زیادہ سے زیادہ

بندا : تم نے مجھے اپنا بھید بتا دیا ہے اور میں نے تمہیں اپنا لیکن تم
نے مجھے ابھی تک اپنی پوری کہتا نہیں سنائی تم نے مجھے یہ نہیں
بتایا کہ جب تم دار سے الگ ہوئے سی مرغ کے سامنے پیٹ کو
بھی سج قرار دیا اُس کے بعد تم نے کہاں پرواز کی پرواز کی
بھی یا لگدھوں کے ہتھے چڑھ کر یہاں پہنچ گئے ؟
پکھرو : (چونچ کھول کر ہنستا ہے) میں نے تمہاری طرح پہلی مرتبہ ہی ہتھیار
نہیں پھینک دیئے تھے۔

بندا : (دل میں) طعنہ دے رہا ہے پکھرو کا بچہ
پکھرو : مجھے اپنے آپ پر مان تھا پکھرو ہونے کا میں اُن پکھروؤں سے
بدا ہو گیا (اور یوں اُن کے سج کا برتن بھی توڑ دیا کیونکہ اب وہ صرف
اُنہیں تھے اور سج تو تیس پکھروؤں کا نام تھا) اور سمندروں
کے اوپر اُن کریمہ سے جا ملا (وہ سیا نے تھے اور سی مرغ

میل دو میل کی بلندی تک پرواز کر کے، لوٹ آنا
 حیاتی نہیں ہو سکتی۔
 ہم اس سے کہیں زیادہ بلندی پر پہنچ سکتے ہیں....
 پرواز کرتے ہوئے عرشوں میں چھید کر سکتے ہیں....
 حیاتی پرواز کا نام ہے....
 اگر تمہیں سچ کی تلاش ہے تو آؤ
 میرے ساتھ پرواز کرو!
 پکھیرو میری بات سن کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔
 (کئی قہقہے لگاتے لگاتے سمندر میں ڈوب گئے۔)
 کسی نے بھی مجھے سنجیدگی سے نہ لیا....
 انہوں نے کہا.... یہ پاگل ہے۔
 پکھیرو کا کام ہی یہی ہے کہ
 کھانا اور بیٹ کر دینا....
 قدرت کی جانب سے معین کردہ بلندی تک جانا اور واپس آ جانا....
 ہمارے آباؤ اجداد بھی یہی کچھ کرتے رہے....
 یہی سچ ہے.... پیٹ بھرنا
 یہی سچ ہے.... بیٹ کرنا
 قدرت کے قانون کے خلاف کوئی پرواز نہیں کر سکتا۔

بندا : پھر کیا ہوا؟

پکھیرو : پھر میں تنہا رہ گیا تمہاری طرح

بندا : پھر گدھ تمہارے پیچھے بڑھ گئے؟

پکھیرو : نہیں.... ابھی نہیں
 میں دوسرے پکھیروں سے الگ ہوا اور....
 پرواز کرنے لگا....
 اپنے پروں کو اک ایسے زاویے پر رکھا کہ
 آسمان میں تارا ہو گیا۔
 بندا : (دل میں) یہ مجھے ”جونہی تنہا لونگ سٹون سی گل“ کا قصہ سنانے لگا ہے۔
 پکھیرو : (دل میں) میں ”جونہی تنہا لونگ سٹون سی گل“ بھی ہوں لیکن اُس سے مختلف
 میں فاختہ، طوطا، چڑیا، بازیا سمندری پرندہ نہیں ہوں صرف پکھیرو
 ہوں.... وہ میں نہیں لیکن میں وہ سب ہوں....
 میرے پروں تلے.... سمندر سکڑنے لگا (جوں جوں میں بلند ہوتا گیا)
 پھر زمین نے اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا....
 اور پھر بالآخر یہ زمین کل کائنات میں....
 ایک گولے کی طرح گھومتی دکھائی دی....
 کسی بچے کے گمشدہ گیند کی طرح دکھائی دینے لگی۔
 میں نے سوچا، میرا وجود....
 اس گیند کے مقابلے میں....
 کتنا حقیر اور بے وقعت ہے....
 میں انہی خیالوں میں گم رہا.... اور
 پروں کی جانب سے غافل ہو گیا....
 اُن کے زاویے کی طرف دھیان نہ کیا.... اور
 پس کرنے لگا۔

میرے نیچے خدایں ٹنگے گیند کا حجم....

آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

آس پاس کی کائنات ختم ہو گئی.... صرف زمین رہ گئی
گیند بڑا ہوتا گیا....

پھر سمندر دکھائی دیا اور وہ بھی بڑا ہوتا گیا....

بالآخر ایک ایسی خدائی،

جس کے ایک جانب کچھ بھی نہ تھا.... خلا!

اور دوسری طرف.... زمین کی کشش تھی۔

میں نے یہ سرحد پار کی اور زمین نے مجھے کھینچا....

(تمہیں تو معلوم ہے کہ زمین کی کشش ہمیشہ مجھ پر غالب آئی)

میں اس کشش کے آگے بے اختیار ہو گیا۔

میرے پروں میں پہلے ہواؤں نے گھونسلے بنائے اور پھر

انہیں چھید دیا....

میں ایک بگولے کی طرح شوکتا ہوا نیچے آیا....

قلا بازیاں کھاتا ہوا، بے بس اور بے اختیار....

اور سمندر پر اس طرح آگرا

جیسے میں پروں کی ایک مُٹھی نہیں ہوں،

لوہے کی اینٹ ہوں....

میں گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا

بندا : لیکن تم تو اچھے بھلے صحیح سالم ہو!

پکھرو : تمہیں اسی طرح دکھائی دیتا ہوں، بڑا ہوا، صحیح سالم.... لیکن سامنے

کچھ ہوتا ہے اور دکھائی کچھ اور دیتا ہے.... آنکھوں کا دھوکہ....

تمہیں میں سالم دکھائی دیتا ہوں لیکن میں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوں

.... میں نے بے انت موتوں کو چکھا اور ان گنت بار زندہ ہوا۔

بندا : (عفا کی طرح تمہاری موت بھی تمہاری زندگی کا آغاز ثابت ہوتی ہے۔)

پکھرو : میں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوں۔

بندا : میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوں.... مر چکا ہوں.... لیکن تمہارا یہ خنجر

تو اس لئے ہوا کہ تم سچ کی تلاش میں تھے.... اور میں.... بیٹھے بٹھائے

ہی ختم ہو گیا۔

پکھرو : بیٹھے بٹھائے کوئی ختم نہیں ہوتا.... میں نے اپنے پروں کے ساتھ ایسی

پرواز کی جو میرے بس سے باہر تھی اور تم نے اپنے دماغ پر سوچوں کا

بوجھ لا دیا.... بیٹھے بٹھائے کوئی ختم نہیں ہوتا....

بندا : میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟

پکھرو : بتاؤ....

بندا : میرے اندر بھی تیری طرح کا ایک پکھرو رہتا ہے (شائد تم ہی....)

پکھرو : (ہاں وہ میں ہی ہوں)

بندا : اُسے بھی سچ کی تلاش ہے.... وہ بھی روٹین سے فرار چاہتا ہے (وہی

پیٹ بھرنا اور بیٹ کرنا) وہ بھی معاشرے سے جدا ہو کر ختم ہو گیا ہے

پکھرو : اُسے (یا مجھے) باہر کیوں نہیں نکالتے؟

بندا : یہ میرے بس میں نہیں ہے.... اُس کے آس پاس دیواریں ہیں۔

(سفید دیواریں) میرے وجود کی دیواریں۔

پکھرو : ان دیواروں کو دھا دو....

اُن اُجاڑ خاموشیوں میں کبھی بندے کی بھاری آواز اُس جہان میں اُس
پر ہونے والے مظالم کی پہچان کرتی اور کبھی پکھرو کی کوک چاروں طرف پھلتی اور
اپنے پروں پر گرتی مصیبتوں اور دکھوں کا قصہ سناتی.... خاموشیاں ٹوٹتیں.... جڑ
جاتیں.... ٹوٹتیں اور پھر جڑ جاتیں.... ٹنڈ سدا کا چپ تھا.... چپ ہی رہا
.... چپ چاپ سُنتا رہا (کیونکہ وہ سن سکتا تھا)

جب سانچہ ہو.... دوستی کی بنیاد ہو.... تب گدھوں کی چونچیں بھول
جاتی ہیں.... چونکوں کی جلن کم ہو جاتی ہے.... پروں کے خون میں بھیسگے ہونے کا
دھیان نہیں رہتا.... وہ دونوں باتیں کرتے رہے.... اپنے دکھ سکھ سناتے رہے۔
صبح ہوتی تو سورج کی روشنی کی پہلی لکیر، پکھرو کی چونچ پر زرد سرسوں کی
طرح پھولتی.... بندے کے ہونٹوں پر سنہری مچھلی کی طرح تیرتی.... اُس کی چونچ
کھلتی.... اُس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہوتے.... پھر وہ باتیں کرتے
.... کل جہان کی باتیں.... اُس جہان کی جہاں سے وہ بھاگ آئے تھے یا بھاگ دیئے گئے

بندا : لیکن یہ دیواریں میں نے تو بلند نہیں کیں.... دوسروں نے کی ہیں۔
یہ پکھرو ان سے سر ٹکرا ٹکرا کر ادھ موا ہو چکا ہے.... پہلے پہل
مجھے اُس کے ہونے کا پختہ یقین تھا.... لیکن اب تو ایک عرصے سے
اُس کے پروں کی سنسناہٹ سنائی نہیں دی، کیا پتہ مرچکا ہو۔
پکھرو : ایسا مت کہو.... اگر وہ پکھرو مر گیا تو تم بھی مر گئے۔
بندا : میں تو مر ہی چکا ہوں۔

گدھ : (دل میں) اگر تم مر چکے ہوتے تو ہم تمہیں کھا چکے ہوتے.... ہم تمہیں
کھا چکے ہوتے.... ہم انتظار کر رہے ہیں تمہارے مرنے کا.... تم دونوں
کے مرنے کا۔



قصہ کہانی ایسی نہ تھی جو اُس چوچ اُن ہونٹوں میں سے نہ نکلا ہو.... وہ چُپ ہو گئے
.... اپنے آس پاس کے اجاڑ میدان کی طرح چُپ.... چُپ.... ٹنڈ کی طرح
چُپ.... چُپ! چُپ! چُپ!



تھے.... اور اس جہان کی جہاں اُن کی اصل حیاتی کا آغاز ہوا تھا.... صبح کے بعد
دوپہر کے الاؤ جلتے.... لیکن اُس کی چوچ، اُس کے ہونٹ بالکل نہ سوکھتے....
بلکہ سانچہ کے پانیوں سے اور زیادہ تر و تازہ ہو جاتے.... وہ ہر اساتھ تھے کہ کہیں
وقت گزر نہ جائے.... اُن میں ایک بے اعتباری تھی کہ اگر وقت ختم ہو گیا اور باتیں
ختم نہ ہوئیں تو....

وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں بھی کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے
اندہ جھانک کر اپنے آپ سے سوال جواب بھی کرتے جاتے.. سوال وہ وجود کے نہاں خالوں
میں کرتے اور جواب کی کشتی دوسری جانب سے تیرتی ہوئی آ جاتی.... بات جسم کی
تاریک کوٹھڑی میں سے جنم لیتی اور وہ دوسرے کے لبوں میں سے مکمل ہو کر باہر آ
جاتی.... ایک کہتا کہ دیکھو اس کنویں میں جہان کو اس کے پانی ٹھنڈے ہیں اور الاؤ بچھا
سکتے ہیں اور دوسرا اُس میں ڈول بن کر اتر جاتا اور پانی نکال نکال کر پہلے پر ڈالنے لگتا....
اور یوں ایک اور دوسرے کا فرق ختم ہوتا گیا.... ایک جو کہانی سناتا وہ دوسرے
کی ہوتی.... دوسرا جو قصہ سناتا وہ تو پہلے کی آپ بیتی ہوتی.... اُن دونوں کی باتیں
ایک جیسی ہو گئیں.... اور اب اگر سردی کا برف سانپ ایک کے وجود کے ساتھ لپٹتا
تو کپکپی دوسرے پر طاری ہو جاتی.... دوسرے کا جسم اگر تپتی ہواؤں سے ٹھلس جاتا
تو ایک کا وجود تپش سے سوکھ جاتا. ساون بھادوں کے حبس میں اگر ایک کے اندر
پسینے کا قطرہ ٹپکتا تو دوسرے کے جسم میں سے یوں دھاریں پھوٹتی جیسے اعلیٰ نسل کی بھینس
کے تھن کو چھونے سے ہی دودھ بہنے لگتا ہے.... وہ ایک تھے.... وہ باتیں کرتے
.... کرتے رہے اور بالآخر ایک ایسا لمحہ آیا کہ.... باتیں ختم ہو گئیں.... پکھرو
پچ بند ہو گئی.... بندے کے ہونٹ سل گئے.... اب کوئی ایسی بات، کوئی

۲۲

چُپ کا ایک اور دن
 بند : میرے سامنے کچھ بھی نہیں۔
 پکھیر : میرے سامنے کچھ بھی نہیں۔

۲۱

چُپ کا ایک دن
 بند : (پکھیر کہاں گیا؟) میں تو آپ ہی اپنے سامنے کھڑا ہوں آئیے میں
 بند۔
 پکھیر : (بند کہاں گیا؟) میں تو آپ ہی اپنے سامنے کھڑا ہوں آئیے
 میں پکھیر۔

جیسے کالا ناگ پٹاری میں شوکتا ہوا نکلے،
 اور پھر ٹنڈ کے شوکھے ہوئے بازوؤں اور پاؤں میں سے
 بڑے بڑے تھے پھوٹنے لگے۔
 پکھرو کا ایک اور پر جھڑ گیا.....
 بندے کے دل کا پٹخ اور مدھم ہو گیا۔
 ٹنڈ میں سے تھے پھوٹتے رہے
 جیسے برسات میں زمین میں سے بیربھوٹیاں
 پھوٹتی ہیں۔
 ایک اور پر گر گیا۔
 آہستہ آہستہ بندے کے پاؤں کے آس پاس
 پروں کا ڈھیر بن گیا۔
 اُس نے اپنے ساتھی، پکھرو کی جانب دیکھا۔
 پروں کے بغیر ماس کی پوٹلی.....
 اُڑانوں کے دن ختم ہوئے.....
 کیونکہ پروں کے بغیر تو وہ نرم گوشت کا....
 ایک چھوٹا سا گولا تھا..... پکھرو نہ تھا۔
 پکھرو کے پنکھ نہ ہوں تو وہ پکھرو کیسا؟
 اُس روز.....
 بندے کو محسوس ہوا کہ.....

لے آگ کے پودے کی کلیاں

(۲۳)

ایک پر.....
 پروں کی پوٹلی میں سے گرا.....
 پکھرو کے وجود سے الگ ہوا.....
 اور بندے کے پاؤں میں آگرا۔
 سائیں کا پٹخ
 بندے کے دل میں سلگتا سائیں کا پٹخ سرد پڑنے لگا۔
 شعلے دھیسے ہونے لگے
 الاؤ کی جگہ، راکھ کے بادل
 دل پر بیٹھنے لگے،
 ٹنڈ میں سے
 دھوئیں کی ایک لکیر لہراتی ہوئی نکلی۔

سردی تمام حدیں عبور کرتی چلی جاتی ہے
 دل کی تپش بھی سردی کے قریب پہنچ کر ..
 ٹھنڈی ہونی جاتی ہے ۔
 اوریوں سردی کا برف ہاتھ اُس کے دل کی جانب
 بڑھنے لگا

دل کے دروازے توڑنے لگا۔
 اور بالآخر سائیں کا چم بچھ گیا، ٹھنڈا ہو گیا۔
 سردی کے برف ہاتھ اُس کے دل پر پھیل گئے۔
 اُسے اپنی گرفت میں لیا
 اور اپنے جیسا کر دیا، ٹھنڈا کر دیا اور برف ۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اُس نے کانپتے ہوئے دل سے پوچھا۔
 دل نے دُوبتے ہوئے جواب دیا ”میں مرنے کو ہوں“
 میری گرمی ختم ہوئی، زمین میں سے نکلنے سردی کے ہاتھ نے
 مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے ۔

میں نے ایک عرصہ تمہارا ساتھ دیا لیکن اب میں بھی تھک چکا ہوں
 ٹھنڈا ہو گیا ہوں

تم اب اپنا خیال خود کر دیکھو“
 اور پکھیرو

جس کے پیروں کو ٹھنڈے ہمیشہ زمین سے چوسی ہوئی حدت
 پہنچاتی تھی
 آج وہ ٹھنڈ بھی یخ پڑا تھا

کیونکہ زمین کی حدت ختم ہو چکی تھی
 پکھیرو کا بدن پروں کے بغیر بدن
 سردی کے ہاتھوں بے اختیار ہو چکا تھا،
 اس طرح کانپتا تھا جیسے بھی ٹھنڈے گرا
 ابھی گرا

وہ اس طرح لرزتا تھا۔ جیسے ابھی ٹھنڈے گرا
 ابھی گرا

وہی پکھیرو، جو سی مرغ کی تلاش میں
 ایسی وادیوں میں سے گذر رہا تھا

جہاں زمین کے وجود کے پہلے دن ہی اس کے چہرے پر
 گہری برفوں کے گھونگھٹ پڑ گئے تھے ۔
 جہاں لاکھوں پکھیروں کا خون برف ہوا
 جہاں پروں کے گیند، برف کے گولے بنے
 اور مر گئے

وہاں، وہ زندہ رہا

اُسے اُس کے اندر کی حدت نے ہمیشہ بچا لیا
 اس حدت کے سامنے برف کے برچھے کچھل گئے

اور وہ زندہ رہا

لیکن آج

”آج یہ کیسی سردی ہے؟“ اُس نے صُحُرتے ہوئے سوچا۔
 ”جس نے اُجاڑ میدان میں سے پھوٹ کر“

ٹنڈ کے بازوؤں اور پاؤں کے راستے

میرے جسم کو چھید دیا ہے

پکھرو کے اندر کی حدت بھی

ختم ہو گئی ۔

کل جہان کے کل پکھرو

وہ جن کے نام تھے اور وہ جو بے نام تھے

اُس کے سامنے اُڑان کرنے لگے

چکی را... مور... بلب... سمندری پکھرو... سی مرغ

اور سب سے آخر میں

وہ آپ اپنے سامنے آگیا پکھرو ۔

جس روز وہ اس میدان میں اُترا تھا

اُس روز اُس کے بدن میں اُترنے والی چونچوں کی اذیت

آج ... اس وقت اس کے جسم میں بلبوں کی طرح

پھٹنے لگی ۔

بندے کے اندر سائیں کا پمخ ختم ہوا تو اُس کے بدن پر بھی

اس میدان میں گزے ان گنت برسوں کے نشان

ظاہر ہونے لگے

اُس کے بال ایک لمحے میں سفید برف ہوئے اور

پھر ایک ایک کر کے جھڑنے لگے

سائے جھڑ گئے (پروں کی مانند)

آنکھوں کے آگے پوٹوں کا ماس ڈھیلا ہو کر ٹک گیا

اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

اُس کی کمر لوث گئی

اور وہ کُبرا ہونے لگا جھک گیا جھکتا گیا

آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹ زمین کے نزدیک ہوتے گئے

آنکھوں کے سامنے مڑوہ ماس کی دیوار اُترنے سے پہلے

اُس کے سامنے

ایک سفید دیوار اُبھری

زمین سے شروع ہو کر عرش تک پہنچتی ہوئی

دیوار کے سفید کینوس پر گزشتہ زندگی کی تصویریں ظاہر ہوئیں

اچھے جولا ہے کا گدھا

مینڈک کا بچہ کرتلی چاچا

گدھ گھروالی بچے گدھ ،

دوست یار اور جنازے ،

لاکھوں جنازے کلمہ شہادت گدھ

یہ تمام تصویریں منتشر ہو گئیں اور صرف ایک تصویر

باقی رہ گئی

وہ آپ اپنے سامنے آگیا بند ۔

اُس کے جسم میں سے چونکوں کی جلن نے سر اٹھایا ۔

چونچوں کی اذیت پھوٹی

پکھرو کا نپا زمین کی کشش تھی

وہ نیچے آن گرا ۔

دونوں گدھوں نے نیچے دیکھا وہی بندہ ایک ٹنڈ اور
ٹنڈ کے قریب پھیرو چاروں طرف اجارہ میدان میں اکلپے کاراج ...

.....

ایک گدھ نے دوسرے گدھ سے کہا: "وقت آگیا ہے"
اور دونوں نے اپنی چونچیں زمین کی جانب کیں اور پر پھیلا دیئے۔

اُس نے اپنی چونچ زمین کے اوپر رکھ دی اور آہستہ آہستہ چونچ
زمین کے اندر چلی گئی واپس اپنی زمین میں۔
بند بے قابو ہو گیا زمین کی کشش تھی

اُس کے ہونٹ زمین کے ساتھ لگ گئے اور آہستہ آہستہ وہ ہونٹ
زمین کے اندر چلے گئے واپس اپنی زمین میں ٹنڈ پر لگے تموں کے منہ
اچانک کھل گئے اُن میں سے لاکھوں مائی بوڑھیوں نے اپنے سفید کفن
سرنکلے اور اُس اجارہ میدان کے اوپر بکھرنے لگیں اس بے حساب
.... ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں اُس ہمواد میدان پر اُڑنے
لگیں اُس روز کی طرح جب اچھے جولاہے کا گدھا آگ کے پودوں کے
درمیان اوندھا پڑا ہوا تھا اور اُس کی جانب گدھوں کی چونچیں بڑھ رہی تھیں،
ایک گدھا، گدھا۔



فاختہ

اب کے سرخ چوک کے آخر میں واقع کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گیندوں کے عین وسط میں ایک گلرنگ انار چھوٹا۔ سرخ گنبد ایک لمحے کے لئے پیلے پڑ گئے۔

آج ماسکو کے ”کراسنایا پلوشت“ یعنی سرخ چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ روسی موسیقی کی تانوں پر تھرکتا، شراب کے نشے میں جھومتا گاتا ایک سیل بے کراں تھا جو چوک سے نکلنے والی سڑکوں سے باہر اُبل رہا تھا۔ ہزاروں انسانی جسموں نے سرخ چوک کو اپنے اندر سمو کر اس کی عظیم وسعت کو بے معنی بنا کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے چاروں اور کھڑی عمارتیں کرمیلن، لینن کا مقبرہ، گم ڈیپارٹمنٹل سٹور، کلیسائے سینٹ باسل، روسی عوام کا عجائب گھر اور گور کی سٹریٹ، ہجوم کی گرمی شوق سے موم ہو کر پگھل جائیں گی اور اس کے بعد یہ سمندر پوئے ماسکو کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ انسانی آوازوں کے شور اور موسیقی کی دھمک سے کرمیلن کا

۲۵

ایک گدھ نے دوسرے سے کہا۔ ”نیچے دیکھ“
دوسرے گدھ نے پر پھیلانے ”کچھ بھی نہیں... وہی اجارہ میدان ہے...
میدان ہے.... اور.... اور“

پہلے گدھ نے ڈکار لیا ”اور.... اور؟“
”وہی اجارہ میدان ہے لیکن....“ دوسرے گدھ کی چونچ پر پسینہ آگیا۔
”لیکن اب وہاں.... ایک اور بند اکھڑا ہے“
”بندا....“ پہلے گدھ نے چونچ کٹکٹائی ”بندا تو ہم نے نوچ کھایا.... ہماری گردنیں ابھی تک اس کے خون سے نچڑ رہی ہیں.... دراصل تم زیادہ کھا گئے ہو اور اسی لئے تمہیں وہاں بند سے کا شبہ ہو رہا ہے....“
”نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں.... شبہ نہیں ہو رہا.... وہاں سچ مچ ایک اور بند اکھڑا ہوا ہے“

آئینوں میں بار اوندھا ہو جائے گا۔

ہر چند منٹ ماسکو کا نیلا آسمان گولوں، پٹانوں، اناروں، پھول جھڑیوں اور ہوائیوں کی آتش بازی چھوٹنے سے کسی تجریدی شاہکار کی مانند رنگین اور شوخ ہو جاتا۔ سیالکا یا مینار کی چوٹی پر نصب سُرخ ستارہ جھلملانے لگتا۔ آتش بازی کی آواز سے اپنے آپ میں گن ہجوم چونک اٹھتا اور لمحہ بھر کے لئے خاموش پڑتا۔ نظریں آسمان پر لگ جاتیں۔ لیکن جونہی آخری شرارہ بھڑک کر بجھتا پھر وہی شور اور موسیقی کی تائیں عود کر آتیں۔

سُرخ چوک کے عین درمیان میں ایک عظیم الاؤ روشن تھا جس کے جلنے کی گرگڑاہٹ کبھی کبھار تمام آوازوں پر حاوی ہو جاتی۔ بے شمار لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے اس الاؤ کے گرد ایک دائرے کی صورت میں ناچ رہے تھے۔ الاؤ کی جلتی بجھتی روشنی میں ان کے چہرے بے حد ہیبت ناک لگ رہے تھے۔ اس میں شامل تمام چہرے ساکن تھے۔ منجھتاثرات کے پیکر۔ نقاب پوشوں کا جشن۔ آج جشن کی رات تھی۔



صرف تین ہفتے قبل جب میں نوٹنگھم میں اپنے کالج کی لائبریری میں داخل ہوا تو نوٹس بورڈ پر سُرخ رنگ کا ایک اشتہار آویزاں تھا۔
”نوجوانوں کا پانچواں عالمی میلہ اس سال ماسکو میں منعقد ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی عمر پچیس سال سے کم ہے اور آپ عالمی امن اور بھائی چارے کے اعلیٰ وارفع مقاصد پر صدق دل سے یقین رکھتے ہیں تو میلے میں شمولیت کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر درخواست روانہ کیجئے۔“

اشتہار کے آخر میں چیکو سلاواکیہ کی کسی انجمن کا پتہ درج تھا۔
”عمر کی شرط تو ابھی میں مزید آٹھ سال تک پوری کرنے کا اہل رہوں گا لیکن کیا میں عالمی امن اور بھائی چارے کے اعلیٰ وارفع مقاصد پر صدق دل سے یقین رکھتا ہوں؟ میں نے لائبریری کے کونے میں سمٹی بیٹھی ایک معنک لڑکی کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ لڑکی نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کے اگلے دو دانتوں میں گھن لگا ہوا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ دے دیا کہ میں ان مقاصد پر بالکل یقین رکھتا

ہوں جب کہ یہ مقاصد نوٹنگم میں گرمیوں کی چھٹیاں گزرنے کی بجائے ماسکو جانے سے ہی پورے ہو سکتے ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا تھا کم از کم روس دیکھنے کا موقع تو مل جائے گا۔ روس جس کے چاروں طرف تناؤ اپنی پردہ آن دنوں اتنا زنگ آلود نہ تھا جتنا ان دنوں ہے۔

کالج سے واپسی پر میں نے ہوسٹل میں ابلے ہوئے آلو گوشت کا گارھا اور بد مزہ مرکب نگلا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر اشتہار پر درج شدہ پتے پر اپنی درخواست روانہ کر دی۔ درخواست کو جاندار بنانے کی خاطر میں نے ہر دوسری سطر میں عالمی امن اور بھائی چارے کے مقدس الفاظ استعمال کئے جن کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ایک ہفتے بعد مجھے مطلع کیا گیا کہ نوجوانوں کی بین الاقوامی انجمن نے مجھے ماسکو کے میلے میں شرکت کرنے والے برطانوی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔ روس میں داخلے کے لئے روسی حکومت خصوصی پاسپورٹ جاری کرے گی اور مجھے صرف آہنی پردے کی دہلیز تک کاریل کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ اس سے پرے تمام اخراجات برائے سفر اور رہائش روس کے محنت کش عوام کے ذمے ہوں گے۔ روسی محنت کش عوام کے لئے میرے دل میں جو عزت تھی اس میں فی الفور گرانقدر اضافہ ہو گیا۔ میں موم ہو رہا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انہی دنوں چند پاکستانی لڑکوں نے لندن یا ترا کے لئے آئے ہوئے پاکستانی وزیراعظم سے ایک ملاقات کے دوران میں درخواست کی کہ ماسکو جانے والے برطانوی وفد میں شامل سینکڑوں پاکستانیوں کو روس پہنچ کر سرکاری طور پر پاکستان کی نمائندگی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ موصوف انہی دنوں تازہ تازہ امریکہ میں رقص کے مختلف انداز میں تصویریں کھینچنے کے علاوہ ہنر سوز کے بحران کے دوران میں عربوں کے لئے "زیر و جمع زیر و برابر ہے زیرو" کا تادیخی جملہ ادا کر کے

پاکستانی عوام کے جذبات کی "ترجمانی" کر چکے تھے۔ چنانچہ روس کا نام سننے ہی بھرک اٹھے اور سختی سے تنبیہ کی کہ خبردار اگر کسی پاکستانی لڑکے نے ماسکو جانے کا نام لیا۔ روس ہمارا دشمن ہے اور جو شخص کسی طور بھی روسیوں سے راہ و رسم بڑھائے غدار وطن ہے۔ آپ لوگ اس وقت لندن میں ہیں اس لئے سرکاری طور پر تو میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ بڑے شوق سے ماسکو جائیے مگر اتنا یاد رکھیے کہ کبھی نہ کبھی تو آپ پاکستان واپس لوٹیں گے اور پھر دیکھئے گا کہ آپ سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

وفد میں شامل اکثر پاکستانی لڑکے فوراً کچھ جذبہ حب الوطنی کو مد نظر رکھتے ہوئے اور بیشتر میانوالی جیل کی کال کوٹھڑی کے تصور سے اپنی اس نازیبا حرکت سے باز آ گئے۔ میں چونکہ ان دنوں نوٹنگم میں قیام پذیر تھا اس لئے مجھے اس نادر شاہی الٹی میٹم کی خبر نہ ہو سکی ورنہ جذبہ حب الوطنی تو مجھ میں بھی تھا اور خاص طور پر جب اپنے ملک کا وزیراعظم اسے کوٹ کوٹ کر بھرے تو نشہ دو چند ہو جاتا ہے۔ بہر حال چند نوجوان ایسے بھی تھے جنہوں نے اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر قبول نہ کیا اور بہر صورت ماسکو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دلیرانہ فیصلے میں ان کے دل گردے کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا بلکہ وہ پاکستان کے ان پیشہ ور سیاسی گھرانوں کے چشم و چراغ تھے جو نظریاتی طور پر چاہے کسی بھی دھڑے سے متعلق ہوں انہیں معلوم تھا کہ وطن واپسی پر ان کی اس "غداری" پر کوئی پرسش نہ ہوگی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وطن میں مالی طور پر اتنے مستحکم تھے کہ ان کی لغزش بھی "منے آئندہ مت کرنا" کے کھاتے میں بڑی آسانی سے ڈالی جاسکتی تھی۔

میرے جیسا للی پٹبے خبری کے عالم میں ان جاسٹس کی جلو میں ہو لیا۔ لندن کے وکٹوریہ سٹیشن اور ماسکو کے بیلورسکی سٹیشن کے درمیان تین روزہ مسافت کے دوران میں بالترتیب رودبار، انگلستان، بلجیم، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، پولینڈ

اور مغربی روس میں سے گزر ہوا۔

پولینڈ کے ایک سٹیشن پر گاڑی ٹکی تو پلیٹ فارم پر لگے لٹکوں میں سے پاؤں کی بجائے بیڑ برآمد ہوئی۔ بیڑ کے اس سیلاب کا ذخیرہ کرنے کے لئے اکثر حضرات کو اپنی پتھر ماسوں کی تنگ دامنی کا احساس ہوا اور گئے وقتوں میں چمڑے کے مشکیزوں کا استعمال نہایت دلفریب معلوم ہوا کہ جن میں دس بیس گیلن شراب نہایت آسانی سے ذخیرہ کی جاسکتی تھی۔ شکر ہے انجن ڈرائیور نے صرف اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر ہی اکتفا کیا ورنہ اگر وہ بھی گاڑی میں سوار اکثر مسافروں کی مانند خوب سیر ہو کر بیڑ نوش کرتا۔ بار بار انجن کی وہل بجا کر خوش ہوتا اور پھر پاؤں پسا کر کوٹلوں والی بوگی میں سو رہتا تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ گاڑی چلی تو تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ وہ چند حضرات بھی جو سٹیشن کے عملہ کی مدد کے بغیر گاڑی میں سوار ہوئے تھے اپنے لبوں پر نیم مسکراہٹیں سجا کر جہاں تھے وہیں لمبے پڑ گئے۔ اس شب ہماری گاڑی میں ہو کا عالم طاری تھا۔ ماسکو کے بیلورسکی سٹیشن کو ہماری آمد کی خوشی میں دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ افسرانِ بالا میں خوش آمدید کہنے کے لئے بنفس نفیس موجود تھے۔ دھواں دار تقاریر ہوتیں۔ پھولوں کے گلے سنے پیش کئے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا عملہ ہمارے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ غرضیکہ وی۔ آئی۔ پی حضرات والی مکمل خوداک، موقع غنیمت جان کر میں نے بھی ایک بیان جاری کر دیا ”ہمسائے ہونے کی بنا پر دونوں ملکوں میں برادرانہ تعلقات کی اہمیت پر زور ثقافتی رشتے۔ تجارتی....“ وغیرہ۔ بعد میں میرے یہ سہری الفاظ ریڈیو ماسکو سے نشر کئے گئے۔ سٹیشن پر ہی برطانوی وفد میں شامل درجن بھر پاکستانی لڑکوں نے ایک علیحدہ وفد کی تشکیل کر کے پاکستان کی غیر سرکاری طور پر نمائندگی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

www.pdfbooksfree.pk

روسی حکومت نے ہمارے قیام کا انتظام ”ہوٹل ذو نوئی کولس“ میں کیا اور سند کے طور پر دو روسی مترجم والنتینا اور یونا ساتھ کر دیئے جو اتنی نستعلیق قسم کی اردو بولتے تھے کہ وفد میں شامل اکثر حضرات گڑ بڑا کر ان سے انگریزی میں گفتگو شروع کر دیتے ایک روز میں نے اپنے کمرے کے لئے فلم خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو گول مٹول چہرے والی قبول صورت و انیتا نے اٹھا کر کہا ”صاحب فلم کا لفظ تو انگریزی زبان میں مستعمل ہے۔ اچی حضرت فیتہ کہیے فیتہ!“ اس خالص لکھنوی انداز سے ان کا دھیان ادھر ادھر ہوتا بھی تو فیض کے شعر نغم سے گنگنا نہ لگتے۔

اور آج صبح دنیا کے وسیع ترین لینن سٹیڈیم میں نوجوانوں کے پانچویں عالمی میلے کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ سینکڑوں ممالک سے آئے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے وفد جنوس کی صورت میں سٹیڈیم میں داخل ہوتے اور حاضرین کے پر خلوص نعروں کا جواب دیتے ہوئے متعینہ جگہوں پر جا بیٹھتے۔ جب میں اپنے مختصر وفد کے آگے آگے پاکستانی پرچم ہاتھ میں تھامے سٹیڈیم میں داخل ہوا تو پورا سٹیڈیم ”روس پاکستان دوستی زندہ باد“ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ایک ایسی گونج جس کی بازگشت ”زیر و جمع زیر و برابر ہے زیر و“ فیم وزیر اعظم کے ایوانوں میں بھی سُنی گئی ہوگی اور پھر ہمارے وفد میں شامل ایک مہاتر لگا لڑکا آگے بڑھا اور مجھ سے پرچم چھین لیا۔

”تم بہت چھوٹے ہو“

اس نے درشتگی سے کہا اور اپنا ۵۵ کلوگرام کی سگریٹ زمین پر پھینک کر پرچم تھامے وفد کی قیادت کرنے لگا۔ وہ ”بڑا“ لڑکا پاکستان کے ایک کروڑ پتی گھرانے کا چٹم و چراغ تھا۔ ایک ایسا گھرانہ جو اپنے ایرکنڈیشنڈ بنگلوں اور لمبی امریکی کاروں میں بیٹھ کر دنیا بھر کے محنت کش عوام کے غم میں ہلکان ہوتا ہے۔

تقریب کے اختتام پر بین الاقوامی امن کی خواہش کے اظہار کے طور پر ساٹھ ہزار

کبوتر فضا میں چھوڑے گئے۔ ان روسی کبوتروں کی اکثریت اسیری کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ وہ سیڈیم سے باہر کی آزاد فضاؤں میں پرواز کر جانے کی بجائے واپس آ کر ہمارے کندھوں پر بیٹھنے لگے۔ ایک امریکی لڑکے نے ایک خوبصورت کبوتر کو دبوچ کر اپنے بیگ میں بند کر لیا۔

”سوونیر“ اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔

سیڈیم سے واپسی ہوئی تو میں بہت تھک چکا تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا نا اس لئے۔ آج شب ماسکو کے سرخ چوک میں پہلے کی افتتاحی تقریب کی خوشی میں ایک عظیم جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا جشن جس میں شمولیت کے لئے لازم تھا کہ ہر شخص اپنا چہرہ چھپا کر آئے۔ نقاب، پوشوں کا جشن..... ہمارے مترجم لیونا اور والنتینا بھی وہاں جا رہے تھے۔ اُدھر پاکستانی وفد میں شامل اکثر لڑکے دریائے ماسکو کے کنارے واقع سرسبز اور خوبصورت سیرگاہوں کی طرف جا چکے تھے۔ جہاں وہ غیر ملکی لڑکیوں کے ساتھ عالمی امن۔ بجائی چائے اور کچھ لو کچھ دو کے اصولوں پر بصیرت افروز گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

میں پہلے تو ہوٹل ذولوتوئی کو بس کی پانچویں منزل پر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کرتا رہا..... مگر آج تو جشن کی رات تھی..... ماسکو کے آسمان پر پھٹتے ہوئے لاتعداد گولوں اور پٹاخوں کے دھماکوں نے مجھے سونے نہ دیا میرا نیم تاریک کمرہ آتش بازی کے مختلف رنگوں کی روشنی سے چمکتا رہا۔ سرخ رنگ دوسرے تمام رنگوں پر غالب تھا..... میرے کمرے کے عین نیچے سڑک پر ہزاروں غیر ملکی نوجوان ایک روسی موسیقار کا ترتیب دیا ہوا ترانہ ”انترناشنال پیس پیس“ گاتے رہے تھے۔ ہوٹل کی بار سے آج واڈ کا شراب مفت مل رہی تھی۔

آخر کار میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کوٹ کے کارڈ پر ایک مٹا سا پاکستانی پرچم سجایا اور سیڑھیاں اتر کر سرخ چوک کی جانب چل دیا۔



انسانی چہرے تھے جو صرف آج کی شب اپنا اصل روپ چھپالینا چاہتے تھے۔
منجھتا تاثرات کے ان پیکروں کی اکثریت رقص میں مشغول تھی۔ اکارڈین
اور بانجو ڈرمز کی موسیقی نے پوسے چوک کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک گروہ بلند
آواز میں روسی گیت الاپ رہا تھا۔ دوسری جانب دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں
لوک گیت گائے جا رہے تھے۔ چند طوطے، نجوم سے پرے دیوار کرملین کے سائے
میں بیٹھے ٹپ ٹپ کرتے شراب پی رہے تھے۔

”ہو ہو“

ایک آلو آنکھیں جھپکتا میرے قریب سے گزر گیا۔
”بو“

ایک چٹریل نے میرے کان میں تان لگائی اور کبھی کبھی ہنستی ہوئی چلی گئی۔
”ہا۔ ہا۔ ہا“

ایک کنگ سانز بچہ ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھامے گھوم رہا تھا۔
”زدر است ویٹے“

بھوسے کوٹ میں ملبوس ایک ریچھ بھول بھول کرتا ہوا میرے پاس آیا اور
روسی زبان میں ”ہیلو“ کہہ کر چلا گیا۔
”ہائے“

سہری رنگ کا چست موٹر پہنے ایک عقاب نے امریکی لہجے کی انگریزی میں
مجھے مخاطب کیا۔

”نمستے مہاراج“

ایک پستہ قد ہاتھی جھولتا ہوا میرے پاس سے گزر گیا۔
”وی موشون“

سُرخ چوک.... جس کے آخر میں واقع کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما
گنبدوں کے عین وسط میں ابھی ابھی ایک گل رنگ انار چھوٹا تھا۔ سُرخ گنبد ایک لمحے
کے لئے پیلے پڑ گئے تھے۔

سُرخ چوک.... جہاں نجوم میں شامل تمام چہرے ساکن تھے۔ منجھتا تاثرات
کے پیکر.... نقاب پوشوں کا جٹن.... آج جٹن کی رات تھی۔

عظیم کراسنایا پلوشت.... جس کی وسعت انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارے
ہوئے سمندر کو اپنے اندر سمو لینے میں ناکام رہی تھی۔ ایسے انسان جنہوں نے آج کی
شب.... اور صرف آج کی شب کے لئے اپنا بھیس بدل رکھا تھا.... اپنے چہرے
چھپا رکھے تھے....

اپنے آپ کو بدل لیا تھا۔ نجوم میں شامل ہر فرد نقاب پہنے ہوئے تھا۔ جانوروں کے
چہرے، عفريتوں کی شکلیں، جن، دیو، بھوت، چڑیلیں، کھوپڑیاں.... کاغذ
اور گتے کے نئے ہوئے ان سے جان نقالوں کے سچے گوشت پوست کے زندہ

سرخ اُبلتی ہوئی آنکھیں اور ایک لہراتی ہوئی لمبی دم۔ ایک اڑدھ سے بڑے آرام سے اپنا تعارف چینی زبان میں کروایا۔ اور لہراتا ہوا آگے کھسکنے لگا۔
”بوانا سلام“

ایک کالا بھسوت بن مانس کسی افریقی زبان میں مجھے کچھ کہہ رہا تھا۔
”بالوسیرا سنیور“

ایک کالا بل ہسپانوی زبان میں پھنکارا اور سُرخ رنگ کی تلاش میں ادھر ادھر آنکھیں گھمانے لگا۔

”کٹ۔ کٹ۔ کٹ۔“

ایک آواز آئی جیسے کسی کے دانت سردی کی شدت سے بجنے لگے ہوں۔
میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے ایک انسانی ڈھانچہ ہنہناہٹا تھا۔ ”ہی۔ ہی۔ ہی۔“

میں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

نقاب پوش نے انسانی ڈھانچے کا نقاب الٹ دیا۔ ڈھانچے کے پیچھے بھی کسی چہرے کی بجائے ایک دانت کشکاتی کھوپڑی تھی۔ خوف کے مارے میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”ڈرو نہیں“

انسانی کھوپڑی نے میرے اور نزدیک آکر کہا۔ ”میں نے دوہرا نقاب پہن رکھا ہے۔ اگر صرف ایک ہی نقاب پہنا جائے تو کوئی لوگ اُسے نوچ کر اتار دیتے ہیں اور اس طرح تمہاری اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے“

”بے شک“

میں نے ہرکلاتے ہوئے کہا۔

”آج تو جشن کی رات ہے“ کھوپڑی نے خوشدلی سے کہا۔ ”اور تم.... تم یہاں بے نقاب گھوم رہے ہو.... اپنی اصلی صورت لئے پھرتے ہو؟“

”ہاں! یہ یہاں اپنی اصلی صورت لئے پھرتا ہے.... اصلی صورت!“
تاریکی میں سے ریچھ چھپتا ہوا برآمد ہوا اور اس نے شور مچا دیا.... عقاب بھی اس کے پہلو پہلو چلا آ رہا تھا۔

”آج کی شب اس جشن میں شامل ہر فرد کو نقاب اور ڈھنپاڑے گا۔ اپنا اصل چھپانا ہوگا“

عقاب کی تیز آواز میرے کانوں میں گھستی چلی گئی اور اس نے اپنے پنجے میرے کندھے میں گاڑ دیئے۔

ہاتھی بھی اپنی سونڈھ ہلاتا جانے کہاں سے نمودار ہو گیا اور ریچھ اور عقاب کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

”ہاں مہاراج بھلا آج کی سندرشام بھلا کون مود کرہ اپنی صورت.... اپنی اصلی صورت دکھاتا ہے.... مہا پاپ.... ہری ادم“

اتنی دیر میں لمبی دم والا اڑدھا بھی ریگتا ہوا آن پہنچا۔

”کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟“

اُس نے ہولے سے پوچھا۔

”یہ اپنی اصلی صورت لئے یہاں گھوم رہا ہے“

ریچھ داڑھا۔

”بہروپ نہیں بھرتا“

عقاب غصے سے بولا۔

”پھر کیا ہوا؟“ اڑدھے نے فلسفیانہ انداز میں نرمی سے کہا۔ ”اگر یہ اپنی اصلیت

برقرار رکھنا چاہتا ہے تو تم کیوں روکتے ہو؟

”ہم روکیں گے“

یہ بچے برہم ہو کر کہا۔

”ہم ضرور روکیں گے“

عقاب نے چونچ ہلاتی۔

”یہ حضرات سو فیصد درست کہتے ہیں۔ جن کے اپنے قوانین ہیں اور اس

میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو ان پر عمل کرنا ہی ہوگا“

ہاتھی کان ہلا کر بناوٹ سے بولا۔

”لیکن.....“ اڑدھے نے احتجاج کے لئے منہ کھولا..... اس کے منہ

میں دانت نہیں تھے۔

”تم کون ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟“

ریچھ اور عقاب نے اڑدھے کو جھاڑ پلائی اور وہ بڑی بیچارگی سے رینگتا ہوا

ایک کونے میں جا بیٹھا۔ ”میرے دانت اُگ آئے دو۔ مجھے اپنی پرانی کینچلی پوری

طرح اتار لینے دو“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”آخر نقاب پہننے میں حرج ہی کیا ہے؟“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بن مانس اور بُل کھڑے التجا کر رہے تھے۔

”بڑے بھائیوں کی بات مان لینی چاہیے۔ نہ مانو گے تو بھوکوں مرو گے“

”نہیں.....“ میں نے تنک کر کہا ”نقاب پہننے سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔

میں اپنا اصل.....“

”کیا ہے تمہارا اصل؟“

ریچھ نفرت سے چلایا۔

”کون سی ہے تمہاری اصلی صورت؟“

عقاب نے غصے میں اپنی چونچ کٹکٹائی۔

”ہم بھی تو دیکھیں آپ کا اصل؟“

ہاتھی اٹھلا کر بولا۔

”تمہارا اصل..... اصلی صورت..... اصل..... اصل“

تینوں بل کر چیخنے لگے۔

”میرا اصل..... میری اصلی صورت“ میری آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی تہ

بھیک آئی اور ہر شے دھندلانے لگی.....



ہوا میں الاؤ کے گرد بے اختیار رقص کئے چلا جا رہا ہوں۔

۷ مادھو پیا میری جھولی بھر دے

الاؤ کی جدت میرے گالوں میں رچ رچ کر پوسے جسم میں آتش سیال کی مانند پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ میری آنکھیں سُرخ رہی ہیں۔ میرے پاؤں دھول سے اٹ گئے ہیں۔ آج مادھو لال حسین کا میلہ ہے۔ میلہ چراغاں۔۔۔۔۔ میرا اصل۔ میرے بالوں میں اور ماتھے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تیر رہے ہیں جو میری آنکھوں میں گرتے ہیں تو میں ایک انجانی لذت کے احساس سے سر جھٹک کر دیوانہ وار رقص کرنے لگتا ہوں۔ ہزاروں لوگ سر نیچا کئے شاہ حسین کے مزار کی سیڑھیاں چڑھ کر الاؤ کی جانب آرہے ہیں اور پھر اپنی عقیدت کے اظہار کے طور اس میں موم بتیاں ڈال کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

مزار سے باہر سڑک کے کنارے کنارے سڑکس کمپنیوں کے خیموں کے باہر مسخرے لوگوں کو ٹکٹ خریدنے پر اکسا رہے ہیں۔ تھیمڑوں کے باہر بلند تھیمڑوں پر گراموفون ریکارڈوں کی تیز دھن پر ہیمڑے ناپچ رہے ہیں۔

موت کا کنواں۔ چین کا جادوگر۔ قسمت کا حال۔ دوسروں والی لڑکی۔ سُرخ مسالے والے میدے کے قلمے اور کباب۔

مٹی کے بنے ہوئے کچے برتن اور گھڑے۔۔۔۔۔ اپنی سوہنیوں کے انتظار میں۔۔۔ ایک طرف قوالی ہو رہی ہے۔ میں آگے بڑھتا ہوں۔۔۔۔۔ لوگ میرے لئے راستہ بناتے ہیں۔۔۔۔۔ میں چمٹے کی لے پر جھومتا ہوا قوالوں کے سامنے کچھی سفید چادر پر رقص کرنے لگتا ہوں۔ مجھ پر وجد طاری ہے۔ سر جھٹکتا ہوں تو ہار میں پروئے موتیے کے پھول میرے گلے سے علیحدہ ہو کر میرے گالوں کو آچھوتے ہیں۔ سفید۔ خوشبودار۔

اکارڈین اور بانگود رمر کی موسیقی مدھم پڑتی چلی گئی اور اس کی جگہ دور کہیں ڈھول کی تھاپ اور چمٹے کی مدھ بھری لے اُبھرنے لگی۔۔۔۔۔ سُرخ پوک کے درمیان جلنے والا الاؤ تیز تر ہوتا چلا گیا۔۔۔۔۔ الاؤ کی جدت سے جشن میں شامل تمام لوگوں کے پہروں سے نقاب خزاں۔ سیدہ پتوں کی مانند خود بخود جھڑنے لگے۔ اُن کا اصل روپ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کا بہروپ۔۔۔۔۔ ان کا سوانگ اب ختم ہو چکا تھا۔ اب ان کے ہاتھوں میں موم بتیاں تھیں۔ جنہیں وہ بڑے احتزام اور پیا سے الاؤ میں ڈال رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں موم بتیاں اس الاؤ میں گچھل رہی تھیں۔ بھڑک کر راکھ ہو رہی تھیں۔ الاؤ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے جلنے سے ایک ایسی گبیھر گڑ گڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی عرشِ معلٰی کے تمام دروازے کھٹکھٹا رہا ہو۔ انہیں توڑ ڈالنے کی سعی کر رہا ہو

۸ من تندور۔ آہیں دے لمبو سچ چڑھیدا مینڈا تن من بچھدا
میرے گلے میں موتیے کا ہار ہے اور ہاتھوں میں ایک جھالروالا چمٹا جسے بجاتا

نازک..... میں صرف انہیں بار بار چھونے کی خاطر سرتیزی سے جھٹکنے لگتا ہوں۔
سفید چادر پر میرے دھول سے اٹے پاؤں کے نشان پڑتے چلے جاتے ہیں۔
.... قوال بھی اپنی لے تیز تر کئے چلے جا رہے ہیں۔

ہے مائے نیکینوں اکھاں درد دھوٹے داحال
دھواں فھکھے میرے مرشد والا جاں پھوللاں تاں لال
سولان مار دیوانی کیتی، برھوں پیاساٹھے خیال
دکھاں دی روٹی، سولان داسالن آہیں دابالن ہال
مائے نیکینوں اکھاں.....

”ہاں! میں سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوں“ ہمائے نصیبوں میں تو دکھوں کی روٹی اور
کانٹوں کا سالن ہی ہے جسے ہم آہوں کی آگ جلا کر پکاتے ہیں..... اپنے آپ کو نوچ
نوچ کر.....“

آہیں دابالن..... بالن..... بالن

قوال جیسے بالن کے لفظ پر اکراٹک گئے ہوں۔ وہ بار بار یہی مصرعہ دہرا رہے
ہیں۔ میں بھی چٹا سر سے اوپر دونوں ہاتھوں میں تھامے اٹک اٹک کر ناچ رہا ہوں
ایک عقیدت مند ہجوم میں سے اٹھ کر میرے پاؤں چولیتا ہے۔ میرے پاؤں جو مادھو
کی مٹی سے اٹے ہیں۔ میں نعرہ لگاتا ہوں۔

ہے مادھو پیا میری جھولی بھر دے

سامعین کے درمیان میں ایک بوڑھا کمر پر پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لا دے
دیوانہ وار رقص کر رہا ہے۔ اُسے اب اتنی ہوش نہیں کہ وہ لوگوں کو پانی پلا کر کچھ پیسے
بنالے۔ وہ اب ان مادی خواہشات سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ جانے وہ کس طرح جان
لیتا ہے کہ میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پیاس سے میری زبان سوکھ رہی ہے

وہ اسی طرح مشکیزہ اٹھائے گلاس ہاتھ میں تھامے میری جانب رقص کرنا ہوا چلا
آتا ہے اور مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی پلاتا ہے..... میں سراٹھا کر اُس کی جانب
دیکھتا ہوں تو وہ مسکرا دیتا ہے ”ایہو ای اصل لے“ وہ بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ
پکڑ کر مجھے پنڈال سے باہر لے جاتا ہے۔

مزار سے پرے ایک ٹنڈ ٹنڈ درخت کے نیچے دس بارہ ملنگ سر جھکا۔
خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک کچا گھڑا ان کے پاس دھرا ہے اور درمیان میں کسی تنادر
درخت کا تنا آہستہ آہستہ سلگ رہا ہے۔ ہوا کا جھونکا آتا تو رکھ اُڑ کر ملنگوں کے
چہروں اور داڑھیوں پر پھیل جاتی۔

”ایہو ای اصل لے“ بوڑھا میرے کان میں سرگوشی کرتا ہے اور پھر اسی طرح
ناچتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔
ملنگ میری جانب شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں سُرخ ہو
رہی ہیں.....

”یا علی مدد“ میں چٹا اٹھا کر نعرہ لگاتا ہوں۔

”مولا علی مدد“ تمام ملنگ بیک وقت جواب دیتے ہیں۔

اجنبیت ختم ہو جاتی ہے۔ اب میں اُن میں سے ہوں۔

میں اُن کے ساتھ زمین پر آلتی پالتی ماسے بیٹھا ہوں.....

میلے کی تمام آوازوں سے بلند دھول کی ”دھم دھم“ اور چمٹے کی ”ایوں آیلوں“

میرے کانوں میں مختلف سمتوں سے اکڑ کر رہی ہے۔ یہ موسیقی ہائی فائی کی مانند

صرف چار سمتوں سے نہیں آ رہی بلکہ اس میں درجنوں سمتیں ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا

میرے چہرے پر بھی رکھ کی تہ جھا دیتا ہے۔ اجنبیت کا آخری پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے۔

”اتنی سردی تو نہیں پھر تم لوگوں نے آگ کیوں جلا رکھی ہے؟“ میں چمٹے سے

راکھ کریدتا ساتھ والے ملنگ سے پوچھتا ہوں۔
 ”آگ“ وہ گھٹنوں میں سے سر اٹھا کر اپنی سرخ آنکھیں مجھ پر جما دیتا ہے۔
 ”ایہہ تے سائیں دا پمچ اے!“

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خاموش بیٹھا رہتا ہوں۔
 وہ اپنے لمبے چوٹے کی جیب میں سے ایک تڑا مڑا سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے
 اور میری جانب بڑھا دیتا ہے۔ میں ایک گہرا کش لگاتا ہوں تو دم باہر کو آنے لگتا
 ہے۔ میں سگریٹ واپس کر دیتا ہوں۔

”باؤ بوٹی پٹیں گا؟“ وہ آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔
 ”لوٹی؟“ میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔ ”کیسی بوٹی؟“
 ”اوتے بوٹی نیٹیں جاندا؟“ ایک نوجوان ملنگ اپنے میل سے اٹے ہوئے پیلے
 دانٹوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھتا ہے اور میرے ہاتھ سے چمٹالے کر ”مچ“ کے
 گرد رقص کرنے لگتا ہے۔

دینیں گھوٹیاں۔ راتیں پتیاں

لو کی کہندے ایہہ مر گئے

اساں مولانا لگلاں کیتیاں!

میرے ساتھ والا ملنگ اپنی انگلیوں سے جلتا ہوا سگریٹ مسل کر اٹھ کھڑا ہوتا
 ہے اور پمچ کے قریب دھرے گھرے میں سے ایک پیالہ بھر لاتا ہے۔

”نہیں!“ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

”پنی جا میری جان تیرا اللہ نگہبان!“ وہ نعرہ لگاتا ہے۔

”نہیں!“ میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔

”مادھو دے ناں دا پی جا!“ اس کی سرخ آنکھیں غصے سے ابلنے لگتی ہیں۔

”نہیں!“ میں چیخ کر کہتا ہوں۔ ”یہ فراریت ہے۔ یہ میرا اصل نہیں“ ملنگ
 مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ”مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ تم ہم میں سے
 نہیں۔ بہروپتے ہو!“ اور پھر ایک سانس میں پیالہ خالی کر کے ”علی حیدر“ کا نعرہ
 لگاتا ہے اور ”مچ“ کے گرد ناچنے لگتا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ کر ایک مرتبہ پھر
 الاؤ کے پاس اکھڑا ہوتا ہوں۔

الاؤ کے گرد کھڑے ہزاروں عقیدت مندوں کے چہرے روشنی سے دمک رہے
 ہیں۔ اُن کے اصلی چہرے وہ سب بے نقاب ہیں۔ یہاں کوئی بہروپ نہیں۔
 میں جیب میں سے موم بنیوں کا آخری بندل نکال کر الاؤ کے بیچ میں پھینک
 دیتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری موم بتیاں آگ میں بجھل نہیں رہیں۔
 جیسے وہ پتھر کی ہوں اور پھر الاؤ دم پڑتا چلا گیا۔ چمٹے ڈھول اور ہارمونیم کی تانیں
 دور ہوتی گئیں۔ میرے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کے چہرے دھندلانے لگے۔



وہ سب بے تحاشا ہنسنے لگتے ہیں۔

”اچھا چلو یہ بتاؤ....“ ریچھ میرے کندھے پر پھینکی دے کر پوچھتا ہے۔

”میرے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟“

”اساں اندر باہر لال ہے اساں مرشد نال پیار ہے“

میں اُسی نیم خوابیدہ کیفیت میں جواب دیتا ہوں۔

”اور میرے بارے میں....“

عقاب اپنے پردوں میں چوہنچ تیز کرتے ہوئے سوال کرتا ہے۔

”اساں ٹکڑے منگ منگ کھا دنا اساں ایہو گم کھا دنا“

یہ کہتے ہوئے میں اپنی نظریں نیچے کر لیتا ہوں۔

”مہاراج کچھ ہمارے بارے میں بھی ہو جائے؟“

ہاتھی کھی کھی کر کے ہنستا ہوا پوچھتا ہے۔

”سچی گل سینیوے کیوں کر پکھی ہڈاں وچ رہتی“

میں آرام سے کہتا ہوں۔

اب کھوپڑی نے آگے بڑھ کر بتیسی کٹکٹائی۔

”مجھے بھی کچھ بتاؤ گے؟“

”ماس جھڑے۔ جھڑ پتھر ہویا کر کن لگیاں بڈیاں“

میں موت کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔

اڑدھا جو اس تمام ہنگامے سے دور ایک کونے میں اپنی پرانی کیپلی آٹارنے کی

کوشش میں محو تھا سر اٹھا کر بولا۔

”تم منافقت برت رہے ہو۔ ان لوگوں سے دُستے ہو.... اپنے جذبات

کا اظہار نہیں کر پاتے۔ بس میں اپنی کیپلی آٹار لوں۔ اب چند دنوں کی بات ہے پھر

پھر ہر شے بدل گئی۔ لوگوں کے ہیولے صاف دکھائی دینے لگے۔ لیکن اب اُن سب نے نقاب پہن رکھے تھے.... موسیقی کی تانیں بھی فضا میں اُبھرا آئیں.... اکارڈین اور بانگو ڈرنز کی موسیقی۔ میرے قدم لاہور میں مادھو لال حسین کے مزار کی کچی مٹی کی بجائے ماسکو کے سرخ چوک کے نوکیلے پتھروں پر جمے تھے۔ ریچھ عقاب۔ بن مانس۔ بُل اور ہاتھی مجھے گھیرے ہوئے تھے۔

”تمہارا اصل.... اصلی صورت.... اصل.... اصل!“

وہ سب چیخ رہے تھے۔

ریچھ نے آگے بڑھ کر مجھے کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلایا۔

”تم بتاتے کیوں نہیں۔ یوں گم سم کیوں کھڑے ہو؟“

میں جیسے ایک خواب سے بیدار ہو جاتا ہوں۔

”میرا اصل.... میری اصلی صورت....؟“ میں بڑبڑاتا ہوں۔

”مجھے خود بھی نہیں معلوم.... نہیں معلوم!“

.... مجھ سے مت ڈرو۔ میرے باسے میں تمہارا کیا خیال ہے؟
 ”کہے حسین فقیر سائیں دا میں نا ہی سب توں!“

میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں۔

اڑدھا اپنا پوپلا منہ کھول کر مسکرانے لگتا ہے۔

”بتہ نہیں کیا بک ہے ہو۔ یہ بولی ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی“
 رچھ اور عقاب غصے سے کہتے ہیں۔

”یہ میرا اصل ہے“

میں سنجیدگی سے جواب دیتا ہوں۔

”ہیں تمہارا اصل بالکل پسند نہیں“

رچھ اور عقاب چیخ کر اعلان کرتے ہیں اور آگے بڑھ کر مجھے دبوچ لیتے ہیں۔

”اس کو ایسا روپ دے دو جو ہمیں پسند ہو“

وہ کھوپڑی کو حکم دیتے ہیں۔

کھوپڑی آگے بڑھتی ہے اور جیب سے ایک نقاب نکال کر زبردستی میرے

چہرے پر جما کر سر کے پیچھے دھاگے کے دونوں سروں کو گرہ لگا دیتی ہے۔

”اب تم ایک انسان نہیں بلکہ ایک خرگوش ہو“

وہ سب مل کر نعرہ لگاتے ہیں اور فبتے لگاتے ہوئے ادھر ادھر، نجوم میں بکھر

جاتے ہیں۔

اڑدھا حسب سابق کونے میں بیٹھا اپنی کینچلی اتانے میں مصروف ہے۔ میں نے

اپنے چہرے کے اوپر جھمکے نقاب کو ہاتھ سے سٹولا۔ واقعی اب میں ایک خرگوش تھا۔

یہ لمبے لمبے کان، دو بڑے بڑے دانت اور مونچھیں۔ انگریزی کا رٹون فلموں والا بگ

بنی۔ اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں گاجریں کھاؤں۔ ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا تو فوراً

باد آیا کہ اب تو میں ایک خرگوش ہوں اور خرگوش ٹائی نہیں لگاتے۔ چنانچہ اس کی بجائے میں نے اپنے ڈھلکے ہوئے لمبے کان سیدھے کئے اور جشن میں حصہ لینے کے لئے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ منجند تاثرات کے پیکر میرے گرد گھوم رہے تھے اور میں بھی اب ان میں سے ایک تھا۔

”نقاب فائدے کی چیز ہے“ میں نے سوچا ”انسان اندر سے چاہے کتنا ہی کریہہ اور بھیانک کیوں نہ ہو نقاب اُسے ایک ایسی شخصیت عطا کر دیتا ہے جو اس کا اصلی روپ دنیا سے چھپائے رکھتی ہے۔ مگر میرا تو ظاہر و باطن ایک تھا پھر بھی میں نقاب پہنے ہوئے تھا.... یہ میری کمزوری کی علامت تھا۔ زور آوروں کو اچھی طرح علم تھا کہ میرا تن تند و رخالی ہے۔ اسے بھرنے کے لئے مجھے اُن کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ میری اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے سوائگ بھرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اُن میں سے صرف اڑدھے کو مجھ سے ہمدردی ہے مگر کون جانے پرانی کینچلی اتانے کے بعد جب اُس کے دانت نکل آئیں تو وہ بھی ان جیسا ہی ہو جائے.... اور وہ ایسا ہو جائے گا۔

لینن کے مقبرے کے عین سامنے ایک گھوڑا جھوم جھوم کر اکرڈین بجا رہا تھا اور چند اونٹ ایک دائرے میں کوئی بے ہنگم سا رقص کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو کر ان کی حرکات سے محظوظ ہونے لگا۔ دائرے کے درمیان میں ایک مگر مجھ بے تحاشا اٹھک بیٹھک کر رہا تھا۔ وہ کوسک رقص ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اونٹ ناچتا ہوا آگے بڑھا اور مہرا لمبا کان پکڑ کر مجھے بھی دائرے کے اندر گھسیٹ لیا۔

”رقص“

اونٹ اپنی تھو تھنی آگے کر کے ببلایا۔ اس کی تھو تھنی میں سے شراب کی

لو آ رہی تھی۔

”مجھے رقص کرنا نہیں آتا“

میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”تاجبنت“

کسی نے روسی زبان میں مجھے ناپچنے کا حکم دیا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ریچھ اونٹوں کے درمیان اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اونٹ سر جھکائے اس کے اشاروں پر ناپچ رہے تھے۔

”تمہارے لمبے کان جڑے اکھڑ دیئے جائیں گے۔ اگر ریچھ مہاراج کے حکم پر عمل نہ کیا۔ تا تھی۔ تا تھی!“

ہاتھی جو ریچھ کے سائے میں بیٹھا تھا جھوم کر کہنے لگا۔

”کم آن بے بی ڈانس!“

وہ کمبخت عقاب بھی کہیں سے برآمد ہو گیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا ادھر دھا کہیں بھی نہ تھا۔

ریچھ اور عقاب کی دھمکیوں نے مجھے مرعوب کر لیا تھا۔... شاید میں بہت

چھوٹا تھا اس لئے.....

”رقص کرو گے نا تو کھانے کو گاہریں ملیں گی“

کسی نے، جھوم میں سے آواز لگائی اور سب اونٹ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

میں نے مگر مجھ کی تقلید کرتے ہوئے اٹھک بیٹھک شروع کر دی۔

”ہو ہو۔ یا ہا۔ ہو ہو“ بے جان چہرے شور مچانے لگے۔

”نرگوش۔ نرگوش“

”گاہروں کے لئے رقص کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی!“

اب اڑدھا بھی اُدھر آنکلا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ مجھے بے حد خفت محسوس ہوئی اور ایک اونٹ کا کان پکڑ کر دائرے سے باہر نکل گیا۔

مجھے اب ہر لمحے یہی دھڑکا لگا تھا کہ وہ کمبخت ریچھ اور عقاب ہمہ اپنے ”ہزنامٹر“ وائس کے پھر کہیں سے نازل نہ ہو جائیں اور کوئی اور الٹی سیدھی فرمائش نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ میں چوک سے ہٹ کر لینن کے مقبرے کے پہلو میں دیوار کرملین کے سائے میں آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم لوگ تھے۔ سرو کے درختوں کی قطاروں اور گھنی پھولدار جھاڑیوں کی وجہ سے یہاں خاصی تاریکی تھی۔ میں نے اپنے لمبے کانوں پر ہاتھ پھیرا اور جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے کو تھا کہ یاد آیا کہ میرے نقاب میں منہ کے سامنے آنکھوں کے آگے بنے ہوئے دو سوراخوں کی طرح کوئی سوراخ نہ تھا۔ یعنی صرف دیکھ سکتے ہو۔ کھانے پینے پر پابندی ہے۔ میں نے سگریٹ واپس جیب میں رکھ لئے اور دیوار کرملین کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں بھی ماحول خاصا پراسرار تھا۔ میرے ذہن میں لینن اور سٹالن کے لاشے ابھرنے لگے.... وہ میرے ساتھ ہی اس سُرخ سنگِ مرمر کے بڑے ڈبے کے اندر ایک تہ خانے میں شیشے کے صندوقوں میں بند لیٹے تھے۔

ماسکویں میری پہلی مصروفیت ان روسی رہنماؤں کی حنوط شدہ لاشیں دیکھنا تھی۔ زائرین کی قطار مقبرے کے دروازے سے شروع ہو کر سُرخ چوک سے باہر گور کی سٹریٹ تک چلی گئی تھی۔ میں بھی ہزاروں روسیوں کے ہمراہ پوری دوپہر اس حویلِ قطار میں رہینگٹا رہا۔ صاف شفاف تہ خانے کے درمیان شیشے کے دو صندوقوں میں لینن اور سٹالن بیٹے ہوئے تھے۔ فوجی وردی میں ملبوس سٹالن کی بڑی بڑی مونچھیں ابھی تک اکڑی ہوئی تھیں۔ اس کے وجہ یہ خدو خال پر

زردی چھائی ہوئی تھی جیسے موم کا بنا ہو موم کا سپا ہی اور لینن اپنے روائتی لباس کوٹ - واسکٹ اور چوڑی ٹائی میں ملبوس - ٹائی کی یہی موٹی اور بھدی گرہ جو اب تک لاکھوں تصاویر اور مجسموں میں امتیازی طور پر ابھری ہے - کشادہ پیشانی اور بال سلیقے سے جھے ہوئے - دونوں رہنماؤں کا چھاتی سے نیچے کا دھڑکبل سے ڈھکا ہوا تھا لینن جس کا اشتراکی نظام آج دنیا کے نصف سے زیادہ حصے پر محیط ہے لینن جس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مزدور اور کسان کو راج سنگھاسن کا صحیح حقدار قرار دیا - مقبرے میں داخل ہوتے ہی ہر روسی کی نظر صندوق میں بندان حنوط شدہ لاشوں پر لگ جاتی - وہ نہایت احترام اور عقیدت سے سر جھکائے خاموشی سے گزرتے ہتے - میں نے دیکھا کئی آنکھیں پر لم تھیں - یہاں درجنوں قوموں کے نمائندے تھے جو ثقافتی اورسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے مگر وہ ایک ہی سیاسی نظام کے تحت ترقی کی جانب رواں دواں تھے - یوکرینین - سائبرین - کاکیشین - ازبک - تاجک - کاسک اور ان سب کے درمیان ایک نو عمر پاکستانی جوان بھی تک اپنے نظام کا تعین نہ کر سکا تھا کچھ لوگ مقبرے کے محافظ سے چوری چھپے صندوق کو جلدی سے چھوہیتے - جیسے ہاسے ہاں قوال لہک لہک کرے

تیری خیر ہو سے پہرے دارا روز سے دی جالی چم لین دے
الاپتے ہیں - ہو سکتا ہے اسی طرح روسی بھی لینن کا صندوق چھوہ لینے کی خواہش کا اظہار لوگ گیتوں میں کرتے ہوں - تہ خانے میں موت کی سی خاموشی تھی ماسوائے گزرتے ہوئے زائرین کے پاؤں کی ہلکی ہلکی چاپ کے - محافظ دبے لفظوں میں ہرزائر کو خاموشی سے آگے بڑھتے جانے کی تلقین کرتے تاکہ گور کی سرٹ تک پہنچی ہوئی طویل قطار کے آخر میں کھڑا شخص بھی مقبرہ بند ہونے سے پیشتر اپنے محبوب

رہنماؤں کا دیدار کر سکے -

انہی دنوں کسی غیر ملکی اخباری نمائندے نے خرو شچوف سے دریافت کیا تھا کہ لینن اور سٹالن کی لاشوں کو ان کی موت کے اتنا عرصہ بعد تک کیسے محفوظ رکھا گیا ہے - اس پر خرو شچوف نے اپنی روائتی خوش دلی بروئے کار لاتے ہوئے جواب دیا تھا - ہر دو ماہ بعد ہم ان بڑھوں کو صندوقوں سے نکال کر ان کے جسم کے اندرونی حصوں کی خوب صفائی کرتے ہیں اور ان میں کیمیائی اجزا بھر دیتے ہیں - بعد میں جب سٹالن کی تاریخی اہمیت ختم کرنے کی مہم چلی تو خرو شچیف نے شاید اسی دو ماہی صفائی کے دوران میں حضرت سٹالن کا صفایا کر دیا - اس کی لاش کو نذر آتش کر کے راکھ دیوار کرملین کے سائے میں دبا دی گئی لیکن یہ تو بہت بعد کی بات تھی - آج سٹالن ہمیشہ کی طرح لینن کے پہلو بہ پہلو سو رہا تھا - لیکن آج اتنا بڑا ہجوم ان عظیم رہنماؤں کی موجودگی سے بے نیاز صرف رقص کرنے اور شور و غل مچانے میں مصروف تھا آج جشن کی رات تھی اور جشن کی رات مرے ہوؤں کی یاد نہیں کیا کرتے -

ایک اور گل رنگ انار کرملین کی دیوار کے عین اوپر چھوٹ کر فضا میں رنگ ہی رنگ بکھیرتا منتشر ہونے لگا - کلیسائے باگوو شنکی اور کلیسائے اسپنکی کے سنہری گنبد تاریکی میں چمکنے لگے - رنگ برنگے ماہتاہوں کی مانند - سُرخ نیلے - زرد - پیلے اور پھر بالآخر سیاہ - انہی کلیساؤں کے تہ خانوں میں آج صبح میں نے کرملین کی سیر کے دوران میں لاتعداد راہبوں کے تابوت دیکھے تھے - وہ کرسی جس پر بیٹھ کر زائر روس کا پادری دغظ کیا کرتا تھا - زاہد روس کا تاج اور قیمتی جواہرات کرملین جس کی چادر دیواری پر بیس مینار شطرنج کے مہروں کی مانند جھے پیٹھے ہیں اور پھر کل شب اسی کرملین کے پر شکوہ دعوتی ہال کی وہ تقریب جہاں میرے علاوہ سینکڑوں

غیر ملکی نوجوانوں کو ایک پرتکلف عصرانے پر مدعو کیا گیا۔ خرو شچیف کی شخصیت حیرت انگیز طو پر مسحور کن تھی۔ دعوت کے اختتام پر اس نے روسی زبان میں ایک جوشیلی تقریر کی۔ ہم سب نے ”میری اودر وزبا“ کا نعرہ امن بلند کیا۔ بلگانن اپنی کوچی داڑھی لئے ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔

ایک دم مقبرے کے دو مسلح محافظ مارچ کرتے ہوئے تاریکی میں سے نمودار ہوئے اور عین جس جگہ میں کھڑا تھا ساکت ہو کر منجمد ہو گئے۔

”ٹن ٹن“ کر میلن کی چار دیواری کے کونے پر کھڑے سیالکایا مینار پر نصب گھڑیاں نے دو بجائے۔ مینار کی چوٹی پر اٹکا ہوا سُرخ ستارہ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ”اب ہوٹل واپس چلا جائے“ میں نے اپنے کان سیدھے کئے اور مونچھیں مروڑتے ہوئے سوچا: ”صبح ایک اجتماعی فارم بھی تو دیکھنے جانا ہے“

میں دیوار کے ساتھ ساتھ اس راستے کی جانب ہو لیا جو سُرخ چوک سے باہر جاتا تھا۔ اس راستے کو ”کرملین پیسج“ کہا جاتا ہے۔ یہاں مکمل تاریکی تھی اور میں نقاب میں بنے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں سے ٹھیک طرح دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میرا پاؤں کسی سخت شے سے ٹکرایا۔ میں نے جھک کر دیکھا.... قبر خنی سُرخ انقلاب میں شہید ہونے والوں کی مشترکہ قبر....

کرملین کی دیوار کے سائے میں گھاس پر ایک غیر ملکی جوڑا بوس و کنار میں محو تھا۔ میں اُن کی عالمی امن اور بھائی چارے کی جذباتی کوششوں میں غل ہوئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سُرخ چوک میں اب بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے.... ایک کونے میں ایک بندر جھوم جھوم کر اکارڈین بجا رہا تھا۔ مگر اس کی لے پر نلپھنے والا کوئی نہ تھا۔ چوک کے بچوں نے چلنے والا غظیم الاؤ بھی اب سرد پڑ چکا تھا اور اس کی داکھ کھردرے پتھروں پر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ آتش بازی کا ذخیرہ بھی شاید ختم ہو چکا تھا۔ میں نے سُرخ چوک اور

سیالکایا مینار کے سُرخ ستارے پر ایک آخری نظر ڈالی اور روسی عوام کے تاریخی عجائب گھر کے ساتھ نکلے ہوئے راستے سے باہر گور کی سٹریٹ پر اُٹلا۔

گور کی سٹریٹ سنسان پڑی تھی اور اس کے دورویہ کھڑے درختوں کی قطاریں رات کے اس پہرے حد بھیانگ لگ رہی تھیں۔ دُور دور تک انسان یا کوئی نقاب پوش انسان صورت جانور بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”زیر زمین ریلوے کی آخری گاڑی تو کب کی رونہ ہو چکی ہوگی“

میں نے سوچا اور ہوٹل کی جانب پیدل ہی چل دیا۔ ماسکو میں جہاں روسی عوام کی مہمان نوازی اور خوش خلقی نے میرا دل موہ لیا۔ وہاں عظیم الشان زیر زمین ریلوے سیشنوں نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ انہیں صرف سیشن کہہ دینا تو زیادتی ہوگی۔ عالی شان محلات تھے۔ قیمتی فانوس، سنگ مرمر کے مجسمے، چمکتے مکینے فرش، سنہری سنون، بیل بوٹوں سے مزین روپہلی چھتیں.... بس ”عالم پناہ تشریف لاتے ہیں“ کی کسر تھی۔ ان نادرن پاروں میں نکالی کھوٹی گاڑی کو دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا۔ ایک اور قباحت بھی تھی۔ سیشنوں کے نام اتنے طویل اور پیچیدہ تھے کہ ”ایکسٹوزار واڈشایا“ کہتے کہتے آدمی کا سانس بھی پھولنے کو آتا اور گاڑی الگ چھوٹ جاتی۔

میں اس سے پیشتر کئی مرتبہ سُرخ چوک سے اپنے ہوٹل تک پیدل جا چکا تھا۔ مگر رات کے اس پہر خاموش عمارتیں اور ویران سڑکیں غیر مانوس سی لگ رہی تھیں۔ بہر حال مجھے یقین تھا کہ اگر میں ناک کی سیدھ میں چلنا جاؤں تو باسانی ہوٹل تک پہنچ جاؤں گا۔ میلے کی افتتاحی تقریب اور اس کے بعد سُرخ چوک کے ہنگامہ خیز جشن میں شمولیت نے مجھے بے حد تھکا دیا تھا اور میں جلد از جلد ہوٹل پہنچ کر آرام سے سو جانا چاہتا تھا۔ میں نے رفتار قدرے تیز کر دی۔

یکدم مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے.... رات کے سناٹے

.... قدموں کی چاپہ.... میں کھڑا ہو گیا۔ خرگوش کے لمبے کان ڈھلکے ہوئے تھے۔
مگر میرے کان آواز پر لگے.... خاموشی! مکمل خاموشی.... کچھ بھی نہ تھا۔
”تیرے کان بچ رہے ہیں“ میں نے خرگوش کے کان پکڑ کر زور سے کہنے ”آخر
خرگوش ہونا! ڈپلوک کہیں کے“ اور پھر چلنا شروع کر دیا۔

روس کا موسم ہمیشہ سے تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ
ماضی میں روسی سپاہ کی بے جگرگی کے پہلو بہ پہلو روسی موسم سرما بھی ملک کی سالمیت
کا محافظ رہا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ البتہ موسم گرما کا معاملہ الگ ہے۔ آج دن کے وقت
اتنی شدید گرمی پڑی کہ میرے ہونٹ میں قیام پذیر ایک ڈینش لڑکے کو سن سرٹوک
ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے تک موسم خوشگوار رہتا اور اس کے بعد تہذیبیج خشکی برپا
چلی جاتی۔ اس وقت بھی ہوا میں خشکی کا پہلو نمایاں تھا۔ لیکن صرف جسم کو ٹھنڈک
کا احساس دلانے کی حد تک.... اس میں کاٹ نہ تھی۔ میں دونوں ہاتھ جیب میں
ڈالے چلا جا رہا تھا۔ نیولین اور ہٹلر تو احمق تھے جو بھرپور سردیوں میں ماسکو یا تبرا
کے لئے چل کھڑے ہوئے.... اس لحاظ سے میں خوش قسمت تھا آج کل گرمیاں
تھیں.... لیکن پھر روسی عوام کو اپنے دوست اور دشمن کی بھی تو پہچان ہے۔ اس
اگر سردیوں میں بھی ماسکو آتا تو مجھے خوش آمدید کہا جاتا۔ سنا ہے کہ سمس کی برفباری کے
بعد سُرخ چوک کے گنبد اور کرمیلن کے مینار سنو وائٹ کے طلسمی قلعے کا روپ دھار
لیتے ہیں۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایک مرتبہ پھر قدموں کی مدھم آوازیں کے
سنائے میں گونج گئی۔

ہلکے ہلکے نازک سے قدم.... ٹپک ٹپک!

میں فوراً رُک گیا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا۔

خاموشی! مکمل سکوت.... کوئی بھی نہ تھا!
میں اب تیز تیز چلنے لگا.... خوف تو نہیں البتہ میں بے چینی سی ضرور محسوس
کر رہا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا شاید بائیں ہاتھ پر یہ وہی گلی تھی جہاں ازبکستان کی
نامور فنکارہ تمارا خانم رہتی تھی.... فلیٹ نمبر ۱۶-۷-۴۶ پر سونے شب اس نے پاکستانی
دفتر کے اعزاز میں اپنے فلیٹ میں ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ازبک پلاؤ
نان، تکتے کباب اور اس کے بعد ازبک رقص اور لوک گیت.... اگر میں اس وقت
تمارا خانم کے فلیٹ کا دروازہ جا کھٹکھٹاؤں تو؟ لیکن کہوں گا کیا؟.... یہی کہ میں
خوفزدہ ہوں۔ میرے کان بچ رہے ہیں.... کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ واہ! خوب نیکامی
کرو گے اپنے ملک کی اور پھر رات کے اس پہر۔

”یہ سب تمہارے دلہمے ہیں“ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور بدستور چلتا رہا۔
میں اب سیٹ بال شوٹی تھیسٹر کے سامنے واقع سورہ دلوا چوک میں پہنچ چکا تھا....
بال شوٹی تھیسٹر جہاں چند روز پیشتر میں نے روس کی ماریہ ناز بیٹے دینا گالینا اولونووا کو
”رومیو اور جیولیت“ کے بیٹے رقص میں دیکھا تھا۔ عمر رسیدہ اولونووا ایک خوشنما تلی
کی مانند ہوا میں تیرتی پھرتی تھی.... تھیسٹر کے کورنٹھن طرز کے ستون اس وقت بہت
بلند معلوم ہو رہے تھے.... چوک کے درمیان والا فوارہ بند پڑا تھا۔ میں نے فوارے
کے تالاب میں سے پانی لے کر منہ پر پھینکے اور پھر ترگنوف چوک کی جانب چل
دیا۔ وہاں سے میرا ہونٹ نزدیک ہی تھا۔

ایک جانی پہچانی آواز پھر میرے کانوں سے آٹکرائی.... قدموں کی چاپ
.... بہت سارے قدم۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے کان وغیرہ نہیں بچ رہے بلکہ پچ کوئی میرا پیچھا

کر رہا ہے۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی.....
سر سرابھٹ سی ہوئی اور اسی لمحہ قدم بھی رُک گئے۔ میں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔
قدموں کی آواز پھر فضا میں اُبھرائی۔ میرے ذہن میں خفیہ پولیس کے موٹے اور گنجے
ایجنٹ ناپچنے لگے اور ماسکو کی خشک شب میں لاہور کی تپتی دوپہر میں پھوٹنے والے
پیسینے کی نمی شامل ہو گئی۔

قدموں کی آواز برابر آ رہی تھی۔ اپنے تلے جانچے ہوئے نازک قدموں کی چاپ
.... میں جان بوجھ کر آہستہ چلتا تو میرا پیچھا کرنے والے قدم بھی سُست پڑ جاتے
اور تیز چلنے سے ان کی رفتار میں بھی فوراً اضافہ ہو جاتا۔

ہے مادھو پیا میری جھولی بھر دے

میں نے گنگانے کی ناکام کوشش کی اپنے خوف کو دبانے کی غرض سے سیٹی
بجانے کے لئے لب سیکڑے تو اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ پتلون کی جیبوں میں میری
مہتیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس چاپ سے کوئی صفر نہ تھا۔ تمام گلیاں
اور بازار سستان پڑے تھے.... کوئی بھی نہ تھا.... صرف آوازیں.... قدموں کی!
اگرچہ ہوٹل پہنچنے کے لئے مجھے بالکل سیدھا جانا تھا مگر میں ایک دم دُرجن سڑیٹ
میں مڑا اور پھر کونے میں ایک بند دکان کے برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ کر
کھڑا ہو گیا۔

قدموں کی آواز فوراً تیز ہو گئی جیسے انہیں خدشہ ہو کہ میں اُن سے فرار ہو
جاؤں گا۔ موڑ پر پہنچ کر قدم قدم سے ٹھٹھکے اور پھر.... میں پھرتی سے ستون کے پیچھے
سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

نیلے رنگ کا چست موٹر پہنے۔ عقاب!

بھورے کوٹ والا۔ ریچھ!

اور سفید لباس میں ملبوس ایک فاختہ!

مگر اب میں ریچھ اور عقاب سے قطعاً خائف نہ تھا.... بہت ہو چکی....
اب اگر انہوں نے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی تو میں ان کے نقاب نوچ
پھینکوں گا اور ان کی اصلیت ظاہر کر دوں گا.... لیکن یہ فاختہ کہاں سے آگئی۔
ان کا آپس میں کیا جوڑ!

میں نے پہلی مرتبہ غور سے ان کے جسمانی خدو خال کا جائزہ لیا۔
تینوں نقاب پوش.... رکیاں تھیں!

ان تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لکھے تھے اور ان کی انگلیاں آپس
میں نہ بچروں کی مانند جکڑی ہوئی تھیں.... جیسے وہ ایک دوسرے کے سہارے کے
بغیر چل نہ سکتی ہوں.... فاختہ درمیان میں تھی۔ وہ تینوں میرے قریب آگئیں۔
ریچھ نے اپنی تھو تھنی آگے کر کے میرے کوٹ کے کالر پر لگا پاکستانی پرچم دکھا
اور سر جھکا کر کہنے لگا۔
”نستے!“

یہ کہتے ہوئے اس نے روائتی انداز میں ہاتھ نہیں جوڑے.... اس کے ایک
ہاتھ کی انگلیاں فاختہ کی انگلیوں میں سختی سے گتھی ہوئی تھیں.... میں خاموش رہا
.... ماسکو میں اکثر لوگ مجھے ہندوستانی جان کر ”نستے“ کہہ دیا کرتے تھے۔

”کیا تم ماسکو میں اجنبی ہو؟“

عقاب نے چوہنچ ہلا کر دریافت کیا۔

”آخراً آپ میرا پیچھا کیوں کر رہی ہیں؟“ میں نے عقاب کا سوال نظر انداز کرتے
ہوئے تشریح سے کہا۔ ”سُرخ چوک کے جشن کے دوران میں آپ دونوں نے جس طرح
مجھے زچ کیا تھا کیا اُس کے بعد کوئی اور کسر بھی باقی ہے؟“

نقابوں کے پیچھے روپوش ہونٹوں میں شاید جنبش ہوتی ہوگی۔ ان کی ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز مجھے تک آ رہی تھی۔

کاش میرے پاس بھی کسی خونخوار جانور کا نقاب ہوتا پھر نیٹا ان سے۔ اب خرگوش جان کر خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہیں۔ میں نے منہ بنایا اور واپس مڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

قدموں کی چاپ پھر سے شروع ہو گئی۔

وہ بدستور میرے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

میں جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ”آخر آپ لوگ چاہتی کیا ہیں؟“

تینوں نے انکار میں سر ہلادیا۔

”کچھ بھی تو نہیں؟“

عقاب نے ملائمت سے کہا۔

”کچھ بھی تو نہیں؟“

ریچھ ٹھوٹھنی لٹکا کر بولا۔

فاختہ خاموش رہی۔

میں اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تو پھر؟“

”دراصل“ ریچھ بالآخر اپنی لمبی تھوٹھنی اٹھا کر ملائمت سے کہنے لگا ”ہمیں غیر ملکی

نوجوانوں سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ اسی لئے ہم سرخ چوک میں تمام عرصہ

صرف آپ کو دیکھتی رہی ہیں۔“

”صرف دیکھتی رہی ہیں“ میں پھٹ پڑا ”بہت خوب! اور یہ جو مجھے خرگوش

بننے پر مجبور کیا گیا ہے وہ کس کی کارستانی ہے؟.... تاہننت۔ کم آن بے بی ڈانس

.... ان اونٹوں کے درمیان میں مجھے دھمکیاں دے کر قص کر دیا گیا.... اور پھر

آپ کا وہ وفادار چچہ ہاتھی.... جس نے صرف آپ دونوں کی شہ پر میری زندگی حرام کر دی.... صرف دیکھتی رہی ہیں۔ ہونہہ!“

ایک مرتبہ پھر دبی دبی ہنسی کی آواز نقابوں کے پیچھے سے برآمد ہوئی۔

”جشن کی رات تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے“

عقاب نے چونچ کھولی۔

”مادھو لال حسین کے میلے میں تو ایسا نہیں ہوتا“

میں نے تنک کر کہا۔

”مادھو....“ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا ”کیا وہاں اس جشن میں

تمام لوگ نقاب پہن کر نہیں جاتے؟“

”نہیں“ میں نے سینہ پھلا کر کہا ”ہمیں اپنے اصل سے پیار ہے“

”تو پھر وہ جشن کیا ہوا جس میں آدمی اپنی اصلیت برقرار رکھے“

ریچھ اور عقاب سر ہلا کر بولے۔

میں نے جواب دینا مناسب نہ جانا۔

قدرے توقف کے بعد ریچھ گویا ہوا۔

”یقین جانیئے ہمارا مقصد آپ کی دل آزاری نہ تھا۔ اگر آپ نے ہماری ان

حرکات کا بُرا مانا ہے تو ہم معذرت خواہ ہیں.... کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”باہکل معذرت خواہ ہیں“

عقاب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”ویسے اگر آدمی جشن میں شامل ہو تو تھوڑی بہت سپورٹس مین سپرٹ تو ہونی

چاہیئے“

”نہیں ہے مجھ میں سپورٹس مین سپرٹ“ میں بھڑک اٹھا۔

”آپ لوگ ہمیشہ اس قسم کی سپرٹ کی سرشاری کے لئے نرگوش جیسے شریف جانور کا انتخاب کیوں کرتے ہیں! کبھی تو طاقتور ریچھ اور عقاب کو اس سلسلے میں مورد الزام ٹھہرائیے“

”آپ تو واقعی ناراض ہو گئے ہیں“
ریچھ کی تھو تھنی لٹک گئی۔

”ہاں! ہاں! ناراض ہو گئے ہیں“
عقاب کی چونچ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی۔
فاختہ کچھ نہ بولی۔

”ہی ہی ہی“ ایک خوفناک قہقہہ ماسکو کی خاموش رات میں گونج گیا۔ نقاب پوش لڑکیوں کے عقب میں کچھ فاصلے پر کھوپڑی ایک تاریک کونے میں سے جھانک رہی تھی۔ وہ ایک کالے چٹنے میں ملبوس تھی جس پر انسانی جسم کے ڈھانچے کی لکیریں کسی ایسے کیمیائی مرکب سے بنی تھیں۔ جو اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ ہڈیوں کی فاسفورس۔ موت ہمارے نقاب میں تھی۔ خوف کی ٹھنڈی سل نے مجھے اپنی پیٹ میں لے لیا۔

”ہماری سہیلی ہے“ ریچھ ہنس دیا۔ ”ڈسنے کی ضرورت نہیں۔ اسے لوگوں کو ڈرانے کا بڑا شوق ہے“

”ہاں! ہماری سہیلی ہے۔ شریر کہیں کی؟“
عقاب نے پیار سے کہا۔

فاختہ حسبِ عادت خاموش کھڑی رہی۔
”خدا حافظ!“

میں نے منہ پھیر کر چلنا شروع کر دیا۔

قدموں کی چاپ! دبی دبی سنسی!
وہ بدستور میرے پیچھے چلی آرہی تھیں۔
میں جھنجھلا گیا۔

”اب اگر آپ میرے پیچھے آئیں تو میں تمہاری تھو تھنی..... اور جناب کی چونچ توڑ کر رکھ دوں گا۔۔۔۔۔ نرگوش ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھ میں عزت نفس قسم کی کوئی شے نہیں“ میں نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔
”ہاں ہاں کیوں نہیں....“ ریچھ اور عقاب ایک ساتھ بول اٹھے۔ ”دیکھتے ہم وعدہ کرتی ہیں کہ اب آپ کو تنگ نہیں کریں گی۔۔۔۔۔ صرف....“

”صرف؟“
”صرف.... اگر آپ بُرا نہ مائیں تو ہم تینوں آپ کے ساتھ ساتھ چلی آئیں؟“
”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“
میں نے ناگواری سے جواب دیا اور پھر چلنے لگا۔
”بہت بہت شکریہ“

ریچھ حقیقتاً ”شکر گزار“ نظر آ رہا تھا۔
”بہت بہت شکریہ“
عقاب کہہ رہا تھا۔
فاختہ کچھ نہ بولی۔

اور پھر تینوں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ انہوں نے حسبِ سابق ایک دوسرے کے ہاتھ سختی سے تھام رکھے تھے۔

ریچھ اور عقاب نے مجھ سے لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔
کیا اب بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں؟

کیا مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ نہیں؟
 لیمن کی قومیتوں کے بارے میں تقریر کے سلسلے میں تمہارا کیا نکتہ نظر ہے؟
 پاکستان میں ایسے گھرانے ہیں جہاں ٹی۔وی اور فرج نہیں؟
 لندن میں تم نے کارل مارکس کی قبر دیکھی ہے؟
 فاختہ نے چونچ تک نہ ہلائی۔ خاموش!

میرا موداب قدرے بہتر ہو چکا تھا اور میں بڑی آسانی سے باتیں کئے چلا جا رہا تھا۔ ریچھ اور عقاب کی خونخواری سے بھی اب میں ذرہ بھر خائف نہ تھا۔ ماہور کی تپتی دوپہریں ایک خواب تھیں۔ میں صرف ماسکو کی خوشگوار رات میں سانس لے رہا تھا۔

ماسکو.... جس کی سیاہ رات میں ایک ریچھ، ایک عقاب اور ایک خرگوش آپس میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے....
 ”خرگوش!“

کسی نے زور سے پکارا اور پھر ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا۔ یہ کھوپڑی تھی۔ ”ہماری سہیلی“ ریچھ اور عقاب نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”شریہ کہیں کی؟“ فاختہ خاموش رہی۔

میں نے اپنے نقاب کے سوراخوں میں سے انہیں غور سے دیکھنے کی کوشش کی.... ریچھ اپنے بھوسے کوٹ میں قدرے فریب نظر آ رہا تھا۔
 عقاب لمبے قد کا تھا اور چست سوئٹر میں سے اُس کے جسمانی ابھار بے حد نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اور فاختہ! درمیانے قد کی۔ دھان پان سی۔

”ان نقابوں کے پیچھے تین خوبصورت لڑکیوں کے چہرے ہونے چاہئیں۔“

میں نے اُن کے متناسب جسمانی خدو خال سے اندازہ لگایا۔
 ”کیا تم روسی زبان جانتے ہو؟“
 ریچھ کو جانے کیا خیال آیا۔
 ”ماہنگی!“

میں نے اُنک کو جواب دیا۔
 ”خراشو! خراشو!“

دونوں بے تحاشا ہنسنے لگیں۔

”کیا میں نے غلط کہا ہے؟“ میں نے تنک کر کہا۔ اس کا مطلب ”تھوڑی تھوڑی“ نہیں ہے کیا؟

”تم نے بالکل درست جواب دیا ہے“ ریچھ کی ہنسی تھمنے میں نہ آ رہی تھی۔
 ”مگر تمہارا لہجہ عجیب سا ہے۔“

”ماسکو آنے سے قبل میں نے غیر ملکی زبانوں کے ایک سکول میں روسی زبان کا چھ ہفتوں کا ایک کرش کورس مکمل کیا تھا۔“ میں نے نقاب کے اندر ناک چڑھائی
 ”اور یہاں آئے ہوئے مجھے ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ اتنے مختصر عرصے میں میں اہل زبان کی مانند گفتگو کرنے سے تو رہا۔“

”اچھا تو پھر یہ بتاؤ۔ کالٹوری چہاس؟“

عقاب نے منک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

میرے کچھ پلے نہ پڑا کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔

”تم ہی نے تو کہا تھا کہ تم روسی زبان جانتے ہو۔“

”اتنی بھی نہیں جانتا کہ یہ کالٹوری وغیرہ سمجھ میں آجائیں۔“

کاٹوری چہاس کا مطلب ہے ”کیا وقت ہوا ہے؟“
 یہ کچھ نے راہنمائی کی۔

”وقت؟“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج کر دس منٹ ہونے کو تھے۔
 ذہن میں روسی زبان کی گنتی دہرائی اور پھر اٹک اٹک کر جواب دیا ”ڈسا پت
 مینوت۔ چٹ وی تروا“
 ”خرا شو۔ خرا شو“

انہوں نے نعرہ تحسین بلند کیا۔ اگر ان کی انگلیاں ایک دوسرے میں یوں
 الجھی نہ ہوتیں تو وہ ضرور تالی پیٹ دیتیں۔
 ”بھلا گا جر کو روسی زبان میں کیا کہتے ہیں؟“

یہ تیر کچھ نے پھینکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سوال پوچھتے وقت نقاب کے پیچھے
 یہ کچھ کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی ہوں گی۔ مجھ غریب خرگوش کا تمسخر اڑایا جا رہا
 تھا۔ پہلے سوچا اسے بتا دوں کہ ابھی تک تو مجھے گا جر کی امریکی انگریزی ہی آتی ہے۔
 جب روسی گا جریں ملیں گی تو وہ بھی سیکھ لیں گا۔ مگر پھر چپ رہنے میں عافیت جانی۔



کچھ دُور چلنے کے بعد ہم ایک وسیع و عریض چوک میں داخل ہو گئے۔ چوک کے
 عین وسط میں جا کر تینوں لڑکیاں یکدم رُک گئیں۔
 ”یہ ترگنوف چوک ہے“

یہ کچھ نے خالص اُستادانہ انداز میں میری معلومات میں اضافہ کیا۔
 ”ترگنوف — عظیم ترین روسیوں میں سے ایک“

غتاب کا لہجہ بھی یہ کچھ ایسا ہی تھا۔
 ”ترگنوف — جس کی مختصر کہانیاں مجھے بے حد پسند ہیں“
 میں نے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے سکون سے کہا۔

اُن دونوں نے مایوسی سے اس طرح سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہوں۔ تو برا تو برا یہ
 دن بھی آنے لگے۔ ایک خرگوش ترگنوف کے باسے میں باتیں کر رہا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ساڑھے تین بجنے کو تھے۔ یکایک مجھے
 شدید تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ میں جلد از جلد اپنے ہوٹل پہنچ کر بستر پر لیٹ جانے

کا خواہش مند تھا.... ان عجیب و غریب لڑکیوں کی دسترس سے باہر۔
”داس وے دانا“

میں نے جلدی سے روسی زبان میں ”خدا حافظ“ کے الفاظ ادا کئے اور چوک سے باہر نکلنے والی بڑی سڑک کی جانب چل دیا۔

”ارے تم کہاں جا رہے ہو؟“

ریچھ اور عقاب نے پکارا۔

”ہوٹل ڈولوتوئی کو لیں“

میں نے رُکے بغیر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”لیکن تم تو ابھی نہیں جا سکتے“

وہ میرے پیچھے چلی آئیں۔

میں شاید اب بھی نہ رُکتا مگر ایک مرتبہ پھر کھوپڑی کا مکروہ قبضہ، ترگنوف چوک میں گونجنے لگا۔

”نہیں جا سکتے۔ نہیں جا سکتے“

وہ چلا رہی تھی۔

”شریر کہیں کی“

عقاب اپنی تیز چوڑی ہلانے لگا۔

”شریر کہیں کی“ ریچھ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ویسے ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم

تو ابھی نہیں جا سکتے“

مجھے معلوم تھا کہ کھوپڑی دراصل ایک نقاب پوش لڑکی ہے۔ اُس نے جس

میں شامل ہونے کے لئے سوانگ بھر رکھا ہے۔ لیکن اُس کے وحشت ناک قبضے نے

میرے وجود کو خوف کے کالے سمندروں میں ڈبو دیا تھا۔ ایک ایسا خوف جو ہر ”موت“

کو ”نہ ہونے“ سے ہوتا ہے۔ میں موت کی اندھی دنیا سے خوفزدہ تھا۔ میرے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ آخر کار میں رُک گیا۔

”لیکن کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتا میں؟“

میں نے انتہائی بے بسی سے دریافت کیا۔

”ابھی بتاتی ہیں“

انہوں نے ہنس کر کہا اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

بالآخر تینوں آگے بڑھیں اور ریچھ بڑے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

”آپ کو یہ خرگوش کا نقاب بالکل اچھا نہیں لگ رہا.... اسے اتار دیجئے“

”جدا ہونے سے پیشتر ہم آپ کا اصل روپ دیکھنے کی متمنی ہیں“

عقاب نرمی سے بولا۔

فاختہ کچھ نہ بولی۔

میں چکرا گیا۔ آخر یہ کس قسم کی لڑکیاں ہیں۔

”میرا اصل روپ؟ بہت خوب! میں نے خرگوش کا یہ نقاب اپنی مرضی سے

تو نہیں پہنا تھا۔ مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ یاد ہے؟“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ”تمہیں

لوگ تو کہتے تھے یہ تم کیا اپنا اصل روپ لئے پھرتے ہو۔ جشن کی رات سب کو نقاب

پہننا پڑتا ہے۔ ہمیں تمہارا اصل روپ پسند نہیں“

”ہم اس سے قبل اپنے فعل پر شرمندگی کا اظہار کر چکی ہیں“ ریچھ اور عقاب سر جھکا

کر کہنے لگے۔ ”ہم نادم ہیں۔ جب انسان ایک بڑے ہجوم کا حصہ ہو تو وہ اس قسم کی

حرکات کر بیٹھتا ہے۔ سرخ چوک میں خاصا اندھیرا تھا۔ ہم آپ کو ٹھیک طرح سے

نہیں دیکھ پائیں تھیں.... پلیز ہمیں اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔ نقاب اتار دیں“

فاختہ نے حسب معمول اس بحث میں حصہ نہ لیا۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔

اگر ان کی یہ ضد پوری کرنے سے گلو خلاصی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔
میں نے سوچا۔

”ٹھیک ہے میں نقاب اتار دوں گا۔“
”خراشو۔ خراشو۔“

انہوں نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر روسی میں کہا۔
”لیکن ایک شرط ہے۔“

میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
”وہ کیا؟“

ریچھ فوراً بولا۔
”وہ کیا؟“

عقاب نے دہرایا۔

”آپ بھی اپنے اپنے نقاب اتار دیجئے۔“

”ہمیں منظور ہے۔“ دونوں نے کورس میں جواب دیا۔ ”لیکن پہلے آپ“ میں نے ترگنوف چوک کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ہم چاروں کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔۔۔ اور سر کے پیچھے بندھی گرہ کو کھول کر اپنا نقاب اتار دیا۔۔۔ میں خرگوش سے دوبارہ انسان کے روپ میں آ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے سے بالکل مختلف ہوں۔ ہلکا پھلکا اور لطیف۔ جیسے سفیدے کے درخت کی چھال اترے تو اس میں سے نرم اور ٹھنڈا گودا نکل آتا ہے۔ وہ تینوں خاموش کھڑی مجھے تکتی رہیں۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر ایک طویل کش لیا۔
”آپ بے شک اس نقاب کے بغیر بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”ریچھ نے بالآخر مہر سکوت توڑی۔ ہم نے آپ کو خرگوش کا نقاب پہنا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔۔۔“

”خیر اس قصے کو اب جانے دیجئے۔“ میں پہلی مرتبہ خوش دلی سے مسکرایا۔
”اب میں بھی آپ تینوں کا اصل روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہماری بھی ایک شرط ہے۔“

عقاب نے شمرارت سے کہا۔

”وعدہ کریں کہ آپ ہماری دوست فاختہ کو اس کے گھڑ تک چھوڑ آئیں گے۔“
ریچھ بول اٹھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

فاختہ نے پھر پھڑکا کر پہلی مرتبہ لب کھولے۔ اس کے بچے میں بے چارگی تھی۔
”تم مت بولو۔۔۔۔۔“

ریچھ نے اُسے ڈانٹ پلائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”اگر آپ ہماری یہ شرط منظور کر لیں تو ہم اپنی سہیلی کھوپڑی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس سے خوفزدہ ہیں۔ کہیئے ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔“

ان عجیب مغرب لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مجھے موت سے بھی نجات مل رہی تھی اور میں ان چہروں کو بھی ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا جنہوں نے ریچھ اور عقاب جیسے وحشت ناک جانوروں کا بھیس بدل کر حشر میں میرا چلنا پھرنا دو بھر کر دیا تھا۔

”نہیں! نہیں!“

فاختہ کو کئے لگی۔

”تم خاموش رہو“ عقاب نے درشتگی سے کہا ”یہ طریقہ کار بچہ مناسب ہے گا.... ہمیں تو صبح سویرے یونیورسٹی جانا ہے اور تم.... اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”بس آپ ہماری دوست کو گھرتک چھوڑ آنے کا وعدہ کریں تو ہم نقاب اتار دیں گی“

”میں وعدہ کرتا ہوں“

میں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
عقاب کا ہاتھ اپنے نقاب کی گرہ تک گیا اور پھر فوراً ہی نیچے چلا آیا ”اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ وعدہ بھی کرنا ہو گا کہ آپ ہماری سہیلی فاختہ کی باہوں میں باہیں ڈال کر چلیں گے“

میں شرما گیا۔ میں ابھی بہت چھوٹا تھا نا اس لئے !

”چلے ہاتھ ہی پکڑ لیجئے گا“
عقاب چمکنے لگا۔

میں نے سر جھکا لیا ”ٹھیک ہے“

دونوں نے بیک وقت اپنے چہرے پر بندھے نقاب اتار دیئے۔

یہ بچہ موٹا ہونے کے باوجود خوش شکل تھا۔ اس میں شاید جنسی کشش بھی ہوگی۔ میں ابھی عمر کے اس حقے تک نہیں پہنچا تھا جہاں ایک لڑکے کی جس ان معاملہ کے بارے میں کمپیوٹر کی طرح کھٹ سے کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔

اور عقاب.... بے حد تیکھا ناک نقشہ۔ اُس کے سوئیٹر تلے کے اُبھاروں کی

طرح.... دونوں خوبصورت تھیں۔

فاختہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

”اور آپ؟“

میں نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”نہیں! نہیں!“

وہ کسمسائی۔

پھر عقاب نے فاختہ کی انگلیوں میں سے اپنی انگلیاں علیحدہ کیں۔ ”یہ اُسے لے کر میری جانب بڑھا اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔“

”مضبوطی سے تھام لیجئے“

فاختہ کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔

”آپ ہماری دوست کو گھرتک چھوڑ آئیں گے نا؟“

موٹی لڑکی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اور اس کا ہاتھ بھی تھامے رکھیں گے۔ ہوں؟“

لمبی لڑکی ہنس کر کہنے لگی۔

میں نے فاختہ کی جانب دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ جیسے اپنے حال پہ قانع ہو۔ جیسے وہ اپنے باسے میں کئے جانے والے فیصلوں کو بااثر مجبوری قبول کرتی ہو۔

”داس وے داینا“

موٹی لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا.... اس کا ہاتھ بے حد گرم تھا۔

”امید ہے ماسکوں میں آپ کا قیام خوشگوار ثابت ہوگا“

لمبی لڑکی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں فاختہ کو خدا حافظ کہے

بغیر پیچھے مڑ کر بالشتونی تعمیر کی جانب چل دیں۔

ہر طرف مکمل سکوت تھا۔

میں فاختہ کا ہاتھ تھامے اس وسیع چوک کے درمیان میں کھڑا عجیب سا محسوس

کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اکیلی گھر جانا پسند کرے۔ مجھے خیال آیا۔

”اگر آپ اکیلی ہی گھر جانا پسند کرتی ہوں تو میں....“

”نہیں.... بالکل نہیں“

فاختہ نے میرا ہاتھ سختی سے نیچا لیا۔

ہم دونوں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ خالی سڑک پر چلنے لگے۔ خنکی کے باوجود میری پتیلی پسینے سے بھیگ رہی تھی اور فاختہ کی سرد انگلیاں مکمل طور پر میری گرفت میں نہیں آ رہی تھیں۔

”تمہاری دونوں سہیلیاں بہت ہی عجیب و غریب کردار کی حامل ہیں“

میں نے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے کہا۔

”میری سہیلیاں؟ وہ کھوسی گئی؟ وہ میری سہیلیاں تو نہیں.... خود غرض اور

منور.... ان کی شخصیتیں صرف نقاب پہن کر ہی مکمل ہوتی ہیں“

”نقاب تو تم نے بھی پہن رکھا ہے؟“

”نقاب میری ضرورت ہے“

میں نے فاختہ کے ہاتھ میں کپکپاہٹ سی محسوس کی۔

”اگر تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہے تو میں اپنا کوٹ اتار کر تمہیں پہنائے

دیتا ہوں“

”نہیں....“ اس نے سختی سے کہا: ”بس آپ میرا ہاتھ مت چھوڑیں“

”بہتر“

میں نے کندھے سے کیٹر کر کہا۔

اب ہم کاموسو لکایا چوک میں سے گزر رہے تھے اور ہمارے سامنے عظیم الشان ہوٹل

لینن گراڈ کی جدید عمارت کھڑی تھی۔ ہوٹل کے کسی کمرے میں بھی روشنی نہ تھی۔ ”جشن

کے دوران میں تمہاری سہیلیاں۔ میرا مطلب ہے ریچھ اور عقاب تو ہر جگہ میرا پیچھا کرتے رہے مگر تم مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئیں؟“

”میں؟“ فاختہ نے سر جھٹکا: ”میں بھی تمہیں نہیں دیکھ سکی.... میں تو آنا ہی

نہیں چاہتی تھی مگر وہ مجھے زبردستی کھینچ لائیں.... خیر اب وہ جا چکی ہیں اور میں

بے حد پرسکون محسوس کر رہی ہوں“ وہ کچھ دیر سر جھٹکائے خاموشی سے چلتی رہی اور

پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”کیا ہم جشن کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں

کر سکتے؟“

”کیوں نہیں“ میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے پاؤں تلے مسلتے ہوئے

کہا: ”لیکن ایسی گفتگو کا آغاز تمہیں کرنا ہوگا“

”اچھا تو تم نے اب تک ماسکوں میں کیا کیا دیکھا ہے؟“

اُس نے فوراً پوچھا۔

”لینن سٹیٹ لائبریری۔ لینن عجائب گھر۔ کرمین۔ زراعتی نمائش۔ لینن کا

مقبرہ....“

میں نے پچھلے چند روز کی مصروفیات کی پوری فہرست سنا دی۔

”تم نے لینن سٹیڈیم نہیں دیکھا کیا؟ سنا ہے اس میں ڈیڑھ لاکھ تماشائی سما

سکتے ہیں؟“

”آج پچھلے پہر نوجوانوں کے پانچویں عالمی میلے کا افتتاح لینن سٹیڈیم میں ہی

تو ہوا تھا“ مجھے اس کی کم علمی پر حیرت ہوئی۔ ویسے روسی لڑکیاں کھیلوں کی بے حد

شوقین ہوتی ہیں۔ تمہیں کون کون سا کھیل پسند ہے۔ ٹرک؟ سومنگ؟

والی بال....“

”مجھے؟“ اس نے جلدی سے کہا: ”مجھے کوئی کھیل پسند نہیں۔ کوئی بھی نہیں“

مجھے بھی کھیل پسند نہیں“ میں نے ہنس کر کہا ”لیکن سیر و سیاحت کا شوق جنوں کی حد تک ہے.... ماسکو کے علاوہ تم نے روس کے اور کون کون سے شہر دیکھے ہیں؟“

”میں نے تو ماسکو بھی نہیں دیکھا“

اس نے سر جھکا لیا۔

میں اس کے اس فترے کی تہ تک نہ پہنچ سکا.... جس لڑکی کی اتنی عجیب و غریب قسم کی سہیلیاں.... یا واقف ہوں وہ خود بھی تو نارمل نہیں ہو سکتی.... میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم دریائے ماسکو جسے مقامی لوگ ”مسکوا“ کہتے ہیں کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں نسبتاً خشکی زیادہ تھی۔ کچھ فاصلے پر بارڈنسکی پل دکھائی دے رہا تھا جہاں سے ہم نے دریائے ماسکو کو عبور کرنا تھا۔ دریا کے کنارے ایک خوبصورت میرگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہم اس میرگاہ کے بچوں بیچ پل کی جانب چلنے لگے۔

دریائے ماسکو کے عین اوپر ایک رنگین ہوائی فضا میں تیر گئی۔ اُس کے شوخ رنگ دریا کے پانی میں منعکس ہوئے اور پھر آخر میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ فاختہ ایک نیم دائرے میں گھوم کر بے اختیار میرے سینے کے ساتھ آگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے برف کی ایک سل کو اپنے آغوش میں لے لیا ہو۔ اس کا پورا جسم بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا ”یوں لگتا ہے جیسے جتن کے لئے آتش بازی کا ذخیرہ ابھی ختم نہیں ہوا“

”آتش بازی؟“

اُس نے سہم کر کہا۔ اس کی انگلیاں ایک آہنی زنجیر کی مانند میری انگلیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے مجھے سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ برف کی سل زندہ تھی۔

اُس کے دل کی دھڑکن میری چوڑی چھاتی پر ہولے ہولے دھک دے رہی تھی۔ یہی ہوئی فاختہ!

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے سنہری بالوں پر رکھ دیا۔

”پلیز مجھے معاف کر دیجئے....“ وہ فوراً مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ لیکن حسب سابق میرا

ہاتھ تھامے رکھا ”مجھے دھماکوں سے بے حد خوف آتا ہے“

”یہ نسوانی فطرت ہے۔ اکثر لڑکیاں دھماکوں سے ڈرا ہی کرتی ہیں۔ حالانکہ....“

”لیکن سچی دھماکے ایک جیسے نہیں ہوا کرتے....“ اس نے رُک کر کہا ”ان میں

آگ ہوتی ہے.... جسم کو جلا دینے والی.... پگھلا دینے والی....“

وہ پھر لایعنی باتیں کر رہی تھی۔

”دریائے ماسکو نے بھی تاریخ کے کتنے انقلاب دیکھے ہیں“ میں نے موضوع بدلنے

کی خاطر کہا اور چلنا شروع کر دیا ”نیولین کی فوج میں شامل چند گھڑ سواروں نے جب

یخ بستہ اور تجمے ہوئے دریائے ماسکو کو عبور کرنا چاہا تو برف چٹخ گئی اور اُن میں سے اکثر

اپنے گھوڑوں سمیت دریا میں ڈوب گئے....“

”دریائے ماسکو....؟“

”ہاں دریائے ماسکو.... تین روز پیشتر ہم سب سیٹمر پر بیٹھ کر ماسکو سے

باہر ایک سفید جنگل میں گئے تھے“

”سفید جنگل؟“

اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں دودھیا سفید۔ سفید سے کے لاکھوں بلند درختوں کا جنگل۔ اُن درختوں کی

چھاؤں میں ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ تھا.... بے حد خوبصورت!“

ہمارے مترجم لیونائے اکارڈین بجانا شروع کر دیا۔ چونکہ ہمارے ساتھ کوئی لڑکی

نہ تھی اس لئے لڑکوں نے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر ناچنا شروع کر دیا۔

”سچ؟.... کتنی عجیب بات ہے؟“
وہ کھکھلا کر ہنس دی۔ کوکنے لگی۔

”عجیب بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں اور تم نے ابھی تک اپنا نقاب نہیں اتارا.... تمہارا اصل....“
”نہیں!.... میرا مطلب ہے ابھی نہیں۔“ اُس نے گہرا کر کہا اور پھر یکدم موضوع بدل دیا۔ ”تم نے مجھے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔“

میں نے اپنا نام بتایا۔

”یہ تو بہت مشکل ہے....“

”کوئی ناموں سے زیادہ مشکل تو نہیں....“ شاریکو پوڈشی پنیکو و سکایا کے بارے میں کیا خیال ہے؟

”یہ تو ایک سرک کا نام ہے۔“ اس نے محفوظ ہو کر کہا۔ ”ویسے میں تمہارا نام ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ اخیگ ڈاہ! ہمیشہ؟

ہتھیلی میں آئے ہوئے پسینے کی وجہ سے میری انگلیاں بار بار فاختہ کی انگلیوں میں سے پھسل رہی تھیں۔ میں اب فاختہ کی جانب دیکھتا تو مجھے بے حد الجھن ہوتی۔ آخر وہ نقاب اتارنے سے گریزاں کیوں ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ریچھ اور عقاب کی مانند وہ خوش شکل نہ ہو۔ احساس کمتری کی شکار!

”تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کون سے شہر کے رہنے والے ہو؟“
اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

”لاہور۔“

”ہندوستان کا ایک تاریخی شہر؟ ہوں؟“
”پاکستان کا....“

میں نے ترش ہو کر کہا۔ عام طور پر روسی لڑکیاں بے حد ذہین ہوتی ہیں۔ مگر یہ فاختہ تو بالکل اُن پرٹھ لگتی تھی۔

”ہاں.... پاکستان“

اس نے سر ہلا دیا۔

”اور تم؟“

”میں منسک کی سہنے والی ہوں۔“

”منسک“

میں نے آہستہ سے دہرایا۔

”ہاں منسک۔ بیلور شیا کا صدر مقام“

”اس شہر کا نام مجھے ہمیشہ ادا کس کر دیتا ہے۔“

”کیوں؟“

فاختہ کے ہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

”وارسا سے ماسکو آتے ہوئے ہماری گاڑی رات کے کسی پہر منسک کے ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ اگرچہ گاڑی نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی مسافر اپنے ڈبے سے نیچے نہ اترے ورنہ اُس کے ہجوم میں کھوجانے کا خدشہ تھا۔ مگر میں اسٹیشن پر جمع اتنے سارے شفیق چہرے دیکھ کر رہ نہ سکا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ فوراً ہی بے شمار لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے مجھے ماسکو سے واپسی پر منسک میں قیام کرنے کی دعوت دی اور پھر بڑی دلچسپی سے میری باتیں سننے لگے۔ ایک لڑکی نے مترجم کے فرائض منصبال لئے۔ میں انہیں اپنی مذہبی اور ثقافتی رسوم کے بارے میں بتانے لگا۔ اچانک میری

نگاہ ہجوم سے پرے ایک بارش کُڑے بوڑھے پر پڑی جو ٹکٹوں کی کھڑکی کا سہارا لئے ٹکٹنگی باندھے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ جوہنی ہماری نظریں ملیں وہ تیزی سے چلا اور لوگوں کو چیرتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے لوگوں کو پرے دھکیل کر سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ اُس کی نیلی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی.... وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا اور پھر ایک لخت مجھے گلے لگا کر چھوئے بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔ اُس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ وہ بار بار روسی زبان میں مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا۔ میرے گالوں اور پیشانی پر شفقت سے ہوسے دیتا اور پھر پیٹ کر رونے لگتا۔ پاس کھڑی لڑکی نے روی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا کہ میرے پانچ نوجوان بیٹے تھے۔ بلند ترین پہاڑوں سے بھی قد میں نکلتے ہوئے۔ ان کے سینے مادر وطن روس سے بھی وسیع تھے۔ کاکیشیا کی حسیناؤں سے بڑھ کر خوبصورت.... وہ پانچوں دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے ہاتھوں مارے گئے.... تم ہو ہو میرے سب سے چھوٹے اور سب سے لاڈلے بیٹے کی مانند ہو.... میں ٹکٹوں کی کھڑکی کے پاس کھڑا تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا.... مجھے اپنا بیٹا یاد آگیا.... تم ہی میرے بیٹے ہو.... بیٹے دنیا کی باگ ڈور اب تم جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے.... یاد رکھنا جنگ سے آج تک کوئی مسکڑے نہیں ہوا۔ صرف لاکھوں کدوروں نوجوان بیٹے لاشے بن جاتے ہیں۔

نوجوان بیٹے جو برسوں کی محنت اور محبت سے مشکل پلتے ہیں اور لاشے جو دودن میں گل سڑ جاتے ہیں۔ میرے بیٹے جنگ بے حد ہونناک چیز ہوتی ہے.... میں نے اس کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔ میری ایک درخواست ہے.... میں تمہارا باپ ہوں.... کبھی جنگ نہ ہونے دینا۔ اپنے ہونے والے بیٹوں کی خاطر دنیا کو ہمیشہ جنگ سے بچائے رکھنا۔

میں ایک لخت خاموش ہو گیا۔ میں فاختہ کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وطن سے دور اس بوڑھے کے سینے کے ساتھ لگ کر میں نے اپنے باپ کی شفقت کی حرارت محسوس کر لی تھی اور پھر میں بھی ہلکے ہلکے کر رونے لگا تھا۔

”ہاں جنگ بہت ہونناک ہوتی ہے“ فاختہ نے مشکل کہا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی ”اور منسک.... منسک میں رہنے والے لوگ ان ہونناکیوں کا سب سے زیادہ شکار ہوئے.... روزانہ سینکڑوں جرمن طیارے ہمارے خوبصورت شہر پر لگ کی بارش کرتے.... میرا پیارا شہر دن رات سنگت رہتا.... ہمارا مکان منسک کی ان چند عمارتوں میں سے ایک تھا جو ابھی تک جرمن بمباری سے محفوظ تھیں.... میری ماں.... میری بوڑھی ضعیف اعتقاد ماں مجھ سے کہا کرتی تھی۔ ”میں خداوند یسوع پر ایمان رکھتی ہوں.... جرمن کبھی بھی ہمارے مکان کو تباہ نہیں کر پائیں گے.... یسوع ہماری مدد کو آئے گا“ مگر پھر ایک شب ہزار پاؤںڈ وزنی آتشیں بم ہمارے صحن کے عین بیچ میں آگرا۔ ایک دھماکہ.... ایک چمک پیدا ہوئی.... آنکھوں کو چندھیا دینے والی چمک.... پورے چھ ماہ بعد مجھے ماسکو کے ایک ہسپتال میں ہوش آئی.... میرا پورا خاندان مکان کے بلے تلے دفن ہو چکا تھا“

میں نے فاختہ کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے“

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر آہستگی سے کہا۔

”ہوں“

اُس نے صرف سر ہلادیا جیسے وہ اس قسم کے رسمی فقرات کی عادی ہو چکی ہو۔ ہم خاموشی سے چلتے گئے۔

ہوا چلتی تو فاختہ کا سفید لباس فضا میں پھڑپھڑاتا۔ وہ اُسے اپنے دوسرے ہاتھ

سے تھپک کر نیچے کر لیتی۔ اُس کے قدم نہایت ہلکے تھے اور وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ صرف میری وجہ سے تمہیں اتنی دور تک آنا پڑا۔ میرا گھر۔۔۔ میرا ہوسٹل یہاں سے ابھی ایک کلومیٹر تو ضرور ہوگا۔“

”اور تم ایک کلومیٹر کا یہ فاصلہ نقاب پہنے ہوئے ہی طے کرو گی؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ میری انجمن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹھیک ہے اگر وہ قبول صورت نہیں بھی تو مجھے اس سے کیا؟ میں اپنے فطرتی تجسس کو مزید نہیں دبا سکتا تھا۔ میں اُسے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ”اُسے اتار دو پلیز!“

”نہیں نہیں“ فاختہ نے دوسرے ہاتھ سے اپنا نقاب تھام لیا۔ جیسے اُسے خدشہ ہو کہ میں زبردستی پر اُتر آؤں گا۔ ”میں ابھی نقاب نہیں اتاروں گی۔ ہوں؟“

”ہو رہا ہے“ ہندو نال ہندو کھڑی شو نال گھونگھٹ کیوں؟“

مادھو نے میرے کان میں چپکے سے کہا اور میں نے شاہ حسین کا یہ پیغام ترجمہ کر کے فاختہ تک پہنچا دیا۔

وہ فوراً رُک گئی۔ ایک لمحے کے لئے میری جانب دیکھا اور پھر چپکے چپکے ہنسنے لگی۔

”ادنیوں! تم غلط سمجھ ہو۔ اس قسم کا ہنسنا کھیلنا میری زندگی کا جز نہیں ہے اور پھر میں یہ کیسے جان سکتی ہوں کہ تم۔۔۔“ اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اچھا صرف ایک منٹ کے لئے نقاب اتار دو۔ میں تمہیں دیکھ لوں پھر بے شک ساری زندگی نہ اتارنا۔“

میں ضد پر اُتر آیا۔

”نہیں۔“

اُس نے درشتگی سے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“

میں سنجیدہ ہو گیا۔

”پلیز بُرا نہ مانو“ اس نے بے حد ملاکت سے کہا ”صرف تھوڑی دیر۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! میں کیوں بُرا ماننے لگا۔“

میرا لہجہ خاصا ترش تھا۔

لڑکیوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اتنا وسیع تو نہ تھا کہ میں فاختہ کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا مگر جذباتی طور پر اس کے انکار نے میری انا کو ٹھیس ضرور پہنچائی تھی۔ ویسے میں چاہتا تو اسی وقت اُسے وہاں چھوڑ کر جا بھی سکتا تھا لیکن فاختہ کا اصل جاننے کا تجسس میرے پاؤں کی زنجیر بنا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر وہ مجھے ماسکو سے دور پنجاب کے کسی دور افتادہ گاؤں کی یاد بھی تو دلدادہ ہی تھی۔ جہاں کی تپتی دوپہر کی دو علامتیں ہمیشہ میرا بچپا کرتی رہتی ہیں۔ آٹا پیسنے والی چکی کے انجن کی لگاتار ”ٹک ٹک ٹک“ اور کیکر کے پر خار درخت میں بیٹھی اکلوتی فاختہ کی آواز کو کو کو کو۔ وطن کی یاد نے مجھے بے حد آواز کر دیا۔ میں اس لڑکی۔۔۔۔۔ اس فاختہ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہوسٹل پہنچنے پر ”داس دے دانا“ کہہ کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔ وہ میرے وطن کی علامت تھی۔ اکلوتی اور آواز فاختہ۔

ہم بارڈرنگ کی پل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پل کے اس پار اس کا ہوسٹل تھا۔

”اگر تم پسند کرو تو ہم تھوڑی دیر کے لئے نیچے دریا کے کنارے کسی بچ پر بیٹھ کر سہارا لیں۔ میں صبح سے پیدل چل رہا ہوں اور خاصا تھک گیا ہوں۔“

میں نے تجویز پیش کی۔

”ہم دونوں؟“

فاختہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ہاں! صرف تھوڑی دیر کے لئے۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننے کا خواہشمند ہوں۔“

میں نے مسکرا کر کہا اور ہم دونوں بار وڈنسکی پُل کے پہلو میں الیٹادہ یونانی ستونوں کے برآمدے میں آگئے۔ یہاں سے دریا کی سطح تک کوئی درجن بھر سیڑھیاں اُترتی تھیں۔

”سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے چلتے ہیں۔“

”سیڑھیاں؟“

وہ ہچکچائی۔

”ہاں بچ تو نیچے دریا کے کنارے کے ساتھ ہی ہوں گے نا؟“ میں نے اُسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ دور سُرخ چوک کے عین اوپر آسمان پر ایک گلزننگ انار چھوٹا اور پھر ساتھ ہی ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ فاختہ کے قدم لڑکھرائے۔ میں نے جلدی سے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر اس کی انگلیاں میری نم آلود گرفت میں سے پھسل کر علیحدہ ہو چکی تھیں۔ اس کا سفید لباس ایک پھریرے کی مانند ہوا میں لہرایا اور وہ درجن بھر سیڑھیوں پر سے کفن میں لپٹی ایک لاش کی طرح لڑھکتی ہوئی دریا کے کنارے پر جا گری۔ میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔

”میں پھر ڈر گئی تھی“ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دیکھ کر چلا کرو“ میں نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور اُس کے دونوں

بازو تھام لئے۔

”میں دیکھ کر نہیں چل سکتی۔ میری آنکھیں نہیں ہیں۔۔۔۔۔ یسوع میری ماں کی

مدد کو نہ آیا۔۔۔۔۔“ اس نے سسکی لے کر کہا اور پھر چہرہ میری جانب اٹھا کر اپنا نقاب اُتار دیا۔۔۔۔۔ ایک خوبصورت مجسمہ جسے تخلیق کر کے خالق نے اُس کی آنکھوں پر مٹی کا

لیپ کر دیا تھا۔

اُسی لمحے ہبک اور گلزننگ انار چھوٹا اور دریا سے ماسکوں کا پانی سُرخ ہو گیا۔
سُرخ!

